

# سینچیت





جدید نظم و غزل کے معتبر فنکار

## معصوم نظر

کا پہلا مجموعہ کلام

# حرف اول

ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے

قیمت : ایک سو پچاس روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

معصوم نظر، شاہد منزل، لال پورہ، ڈونگر پور، ۳۱۳۰۰۱



## ایڈورڈ سعید کے خیالات

میری زندگی میں اجنبیت اور بے جڑ پن کے احساسات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ میں باہر کا آدمی ہوں۔ لیکن صرف باہری آدمی نہیں، بلکہ میں ایسا آدمی بھی ہوں جس کے لئے وقت کے گزرنے کے ساتھ، واپس لوٹ کر جانے کے لئے جیسے کم ہوتی چلی گئی ہیں۔ میں فلسطین واپس نہیں جاسکتا۔ اس کی وجہیں بالکل ظاہر ہیں، اور ان میں زیادہ تر سیاسی ہیں۔ جس مصر میں میرا بچپن گزرا، میں اس مصر میں واپس نہیں جاسکتا (یعنی وہاں کے سیاسی حالات بدل گئے ہیں) اور اب میں لبنان بھی واپس نہیں جاسکتا جہاں میری ماں رہتی ہیں اور جہاں کی میری بیوی ہیں۔ میری زندگی کا یہی منظر جگہوں کو ترک کرنے اور جگہ سے بے جگہ ہونے کے سلسلوں سے عبارت ہے، ایسے سلسلے جن کے نشانات اور اثرات اب ختم بھی نہیں کئے جاسکتے۔ دو تہذیبوں کے درمیان وجود رکھنے کا احساس مجھ میں شدید، بہت شدید رہا ہے۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ سب سے مضبوط دھماکا جو میری زندگی میں رواں رہا ہے، وہ یہی ہے کہ میں چیزوں اور جگہوں میں داخل ہوتا اور پھر نکلتا رہا ہوں۔ میں بہت دیر تک کہیں کا، کسی چیز کا نہیں رہ سکا ہوں۔

میں ادب کا طالب علم اس لئے تھا کہ مجھے ہمیشہ ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ اور اس وجہ سے بھی میں ادب کا طالب علم تھا کہ جو چیزیں ادب کے گویا کردہ پیش میں ہیں، جیسے فلسفہ، موسیقی، تاریخ، سیاسیات، اور سماجیات، ان کی وجہ سے ادب کا طالب علم اور بھی کی انسانی حوال اور حرکات میں دلچسپی لے سکتا ہے۔

[جہاں تک فلسطین کو واپس کا امکان ہے تو] میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں واپس جاسکوں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر دھم کے جس حصے کا میں ہوں، یعنی مغربی حصے کا، تو وہ شروع سے ہی ۱۹۴۸ کے اسرائیل کا ایک حصہ رہا ہے، اور ہر دھم کا وہ علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں میں باسالی مراجعت کر سکوں گا۔ اور یہ تو یہ ہے کہ جلاوطنی کا احساس اور اس کا تصور مجھ میں اب اس قدر شدید اور پر قوت ہے کہ میں اس طرح کی کسی مراجعت کے ذریعے اسے طعنا یا نرم نہ کر سکوں گا۔

اور بہر حال، میرا تو خیال یہ ہے کہ میں کسی ایسے فلسطین میں یقین نہیں رکھ سکتا ہوں جس کا وجود ہی تقسیم ملک کا سر ہون صحت ہو۔ میں نے یہ خیال بالکل ترک کر دیا ہے کہ سیاسی مسائل کا حل یہ ہے کہ علاقوں اور خطوں کو چھوڑنے، اور پھر اور بھی چھوڑنے، تقسیم پر میرا اعتقاد نہیں ہے، نہ تو سیاسی سطح پر، نہ انسانی آبادی کی سطح پر، اور نہ ہی کسی بھی قسم کی ذہنی یا روحانی سطح پر۔ یہ سارا تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ قوموں اور معاشرہ کے حصے غزے کے جائیں۔ برابری کا کوئی بھی تصور، کنڈمین کا فلاں فلاں حصہ فلسطینی یا اسرائیلی وطن کدہ ہے، مجھے بالکل چھوڑنا اور غیر حتمی معلوم ہوتا ہے۔ بے شک میں اس بات کے حق میں ہوں کہ لوگوں کو اپنا سیاسی مستقبل خود طے کرنا چاہئے، لہذا اگر کوئی معاشرہ یا قوم تقسیم چاہے تو ٹھیک ہے، اسے تقسیم ہونے دیجئے۔ لیکن میں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں اس کارگزاری میں شریک ہوں۔

اگر ہارٹ فرپ فرائی (Northrop Frye) اور جاک (Jacque Derrida) کا مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں، لوگوں کے درمیان، اپنی زندگیوں میں گزارتے ہیں کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں ان کے اپنے ہی خیالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں دنیا میں جہاں بھی جاتا ہوں وہاں مجھے اپنے سیاسی موقف کی لفظی تصویر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں اگر کسی ادبی یا واضح طور پر غیر سیاسی موضوع پر بھی لکھ رہا ہوں تو بھی ہمیشہ تنقید کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

مجھے جس چیز میں دلچسپی ہے وہ ہارٹ فرپ فرائی (Northrop Frye) کے بیان کردہ ادب سے نہیں ہے، کہ ادب الگ ہی سے ایک مکمل نظام ہے۔ نہیں، مجھے ادب سے دلچسپی اس لئے ہے کہ وہ اور بھی کی چیزوں سے وابستہ ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ان کی طرح سے سمجھ کر ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہ کرے گا کہ شلا کیلس (Keats) کی ایک اودا (Ode) یا والیس اسٹیونس (Wallace Stevens) کی ایک نظم میں ادبی صفات ہیں۔ لیکن کیا وہ ادبی صفات اپنے اندر، اور اپنی حیثیت سے خود منظمی اور دلچسپ ہیں، اور کسی شخص کے ذاتی لفظ اور صورت کے علاوہ ان میں کچھ نہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ لفظ اندوزی شاید اپنی جگہ پر کافی ہو، لیکن اگر ہم ان صفات کے بارے میں بات کرنا چاہیں گے تو ہم ان صفات کو دوسری چیزوں سے مربوط کر کے اپنی لفظ اندوزی میں اضافہ ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۹۸۶ کے ایک انٹرویو سے اقتباسات)

From *Criticism in Society*, Interviews conducted by Imre Szustak



# سبحان

اکتوبر ۲۰۰۳

مدیر، پرترا، پبلشر: عقیلہ شاہین  
فون نمبر: 91-532-2622693  
E-mail: srfaruqi@sancharnet.in  
سرورق: شاداب سچ انرماں  
کپورنگ: ریاض کمپیوٹرز، شارپ ٹریک کمپیوٹرز  
گڈ شہرے کا سرورق: عادل منصوری  
مطبع: انصاری آفسیٹ، الہ آباد، پریجات آفسیٹ، الہ آباد  
کوریئر کے لئے پتہ: 29C, Hastings Road  
Allahabad-211001  
نی شمارہ: چوبیس روپے  
بارہ شمارے: دو سو چالیس روپے  
جلد: ۳۸  
شمارہ: ۲۷۳  
تربل زرکاپتہ: ۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد-۲۱۱۰۰۳  
خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۳، الہ آباد-۲۱۱۰۰۳  
طالب علموں کے لئے سالانہ قیمت: دو سو روپے

ایڈیٹور ڈ سعید کے خیالات	کرشن کمار طور	عزل	شمس الرحمن فاروقی اردو، سائنس اور
۱	رشید امجد	عکس دہندہ چراغ	۲۰
۲	محمد انظہار الحق	پر تپال سنگھ جیتاب دو غزلیں	۲۳
۵	محمد سلیم الرحمن	شاہین دو نظمیں	۲۴
۶	تبسم کاشمیری وہاں کوئی بھی نہیں تھا	علی ظہیر ست کمری	۲۵
۷	تبسم کاشمیری	چندر پرکاش شاد عزل	۲۵
۸	سید امین اشرف	جمیل الرحمن تین غزلیں	۲۶
۹	اسد محمد خاں	عرفان صدیقی، نیر مسعود،	
۱۱	شہر یار	شمس الرحمن فاروقی نظمیں انیس	۲۷
۱۲	محمود سعیدی	شمس فریدی نظم، عزل	۳۵
۱۳	عبدالاحد ساز	شاہین عباس چار غزلیں	۳۶
۱۴	امجد اسلام امجد	شفیق سوپوری دو غزلیں	۳۸
۱۵	توصیف تبسم	علی محمد فرشی میں باہر کے اندر	۳۹
۱۶	غلام حسین ساجد توصیف تبسم غزلیں	رفیق راز تین غزلیں	۴۰
۱۷	غلام حسین ساجد	محمد عاصم بٹ حکایات خون	۴۱
۱۸	غلام مرتضیٰ رائی	چکان	۴۱
		اس بزم میں	۸۰
		فیصل ہاشمی تین نظمیں	۶۰
		عالم خورشید دو غزلیں	۶۱
		جلپیس نجیب آبادی عزل، نظم	۶۲
		شکیلہ رفیق کنی ہے میر گول کان ہر سے	۶۳
		محمود و واجد ادب اور سماجی نعرہ	۶۷
		تنویر اعجاز، اوم پر بھاکر نظم عزل	۶۹
		حنیف نجمی دو غزلیں	۷۰
		فیض، اسعد بدایونی کی	۷۱
		سید محمد اشرف یاد میں	
		سوانحی گوشے	۷۲
		کہتی ہے خلق خدا	۷۳
		اخبار و اذکار	۸۰
		اس بزم میں	۸۰

ترتیب و تسمیہ

شمس الرحمن فاروقی





پھر گرد نے لی ہے انگڑائی کوئی آئے گا  
 پھر دل پر جیسے دھمک پڑی کوئی آئے گا  
 کوئی آئے گا بادل کی شکل بتاتی ہے  
 کہتی ہے پرندے کی بولی کوئی آئے گا  
 کوئی رخصت ہو گا گہری شام کی بارش میں  
 پھر صبح سے جمائے گی تہلی کوئی آئے گا  
 کوئی آئے گا اور سب کچھ بدل کے رکھ دے گا  
 یہ خلقت بھی، یہ سورج بھی، کوئی آئے گا  
 کوئی آئے گا اور غربت اطلس پہنے گی  
 بیچارگی کرنیں اوڑھے گی کوئی آئے گا  
 جو مٹی پاؤں کے نیچے آتی رہتی ہے  
 کبھی ہوگی اس کی داوری کوئی آئے گا  
 جو کہیں نہیں وہ آوازیں بھی سنتا ہوں  
 مجھے دور سے ہے یہ خبر آئی کوئی آئے گا  
 مجھے دی ہے سنوترنہ کی خاک نے خوش خبری  
 مجھے مرو سے کہتی ہے مٹی کوئی آئے گا  
 مجھے خوشبو آئی ہے انجیر کے پکنے کی  
 مجھے رو کے گیسوں کی مستی کوئی آئے گا

مرے تئیں کا ہے شور عجب کچھ سمجھو تو  
مرے شیشم کی ہے چھاؤں کوئی آئے گا  
مرے کیکر لہ گئے سونے جیسے پھولوں سے  
مرے پہنوں میں سرسوں پھولی کوئی آئے گا  
مری چہست سے تیل انگور کی اٹھ اٹھ کھیتی ہے  
مرے توت پہ پینچی ہے قمری کوئی آئے گا  
مرے شہد کا چھتہ چمک رہا ہے پھلا ہی پر  
مرے دودھ امانت مہماں کی کوئی آئے گا  
مرے رخساروں پر پھول کھلائے ان دیکھے  
مرے ہونٹوں کو دی شیرینی کوئی آئے گا  
مری نیندیں قرض کی ہیں واپس ہو جائیں گی  
مرے خواب مسافر کی پونجی کوئی آئے گا  
مری آنکھیں مند مند جاتی ہیں کوئی بات تو ہے  
مرے خون میں کیوں ہے لرزش ہی کوئی آئے گا

مرے جگنو گھاس اور شبنم استقبال کریں  
مری منی یوں ہی نہیں بکھری کوئی آئے گا  
مری خوشیوں کا کیا پوچھتے ہو تم دیکھو گے  
مری آنکھوں پر اس کی ایڑی کوئی آئے گا  
ہر سمت سے وقت رواں ہے مری ہی جانب  
دیکھو تو یہ پیغامبری کوئی آئے گا  
کہیں دور سے از کراک غالیچہ آتا ہے  
یا شہزادہ یا لال پری کوئی آئے گا  
یہ فرغل آنکھیں کات کے میں نے بنایا ہے  
پھر اس پر ناکی اپنی ہنسی کوئی آئے گا



## محمد سلیم الرحمن

افق سے ابھرتے ہوئے یہ ستارے ہیں آیات اس جادواں روشنی کی جو افلاک کی غلٹوں میں ہمیشہ سفر بھی ہے اور گردشوں کی جزا بھی منازل جو گرداب کون و مکاں میں کسی لفظ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں یہ تقدیر کے آئینے جن پہ کب سے جمی ہیں ہر اک راہرو کی نگاہیں۔

چمک دار موجوں کے کالے ورق پر لکھا لائینوں نے اک جھلک سا نوشتہ مقدس رکھا، جیسے کہانت کسی دیوتا کی، اہل اور ابو جمہی مگر کشتیوں، گودیوں اور تہوج کی ہلچل میں فرصت کسے بوجھنے کی جہازوں پہ ہوا ہار و پہلے دھوئیں کی اڑان اور اونچی کرینوں کی گردش۔

دھوئیں کی طرح فاصلوں اور اندھیروں میں گم ہونے والی،

تھے جن کے پیاسو

تمہارے وطن کی مہکتی شیاروں، پھلوں سے لدی بازوؤں اور بنوں میں عجب رنگ تھے اور بے نام بوئے، بھجن اور اراج کے اچھوتے خزانے؛ کھلی زندگی اور شفاف خوشیوں کے سوتے، جو گھیر اور دانگی تھے۔

ہیلے کچو کے کی مانند سیٹی فضا میں کبھی اور چنی سے ابھرا

کبودی ستون اور انجن دھب کر بنے غلٹوں میں دھڑکتے ہوئے دل۔ دھوئیں، ازدحام اور چیخوں سے مضبوط گودی، کنارے کے چکنے غلام سے بچھا چھڑا کر کھلے آسمان اور بڑھتے ہوئے امن کی شادمانی۔

یہ سنسان، زخارف رخ جہاں پر دھوئیں کی کدورت، مٹینی دہاڑیں کسی خواب میں دھند اور گونج کے پیکروں کی نری ناتواں کوششیں ہیں۔ یونہی باد و باران کے گھٹنگور موسم کی آنکھوں پہر بر ملا مار کھاتا عقب میں سفیدی بلوتا ہوا یہ سفید نندا سی مسافت میں گم ہے۔

سیرال، رنگ اور برادے سے بد شکل عرش، بجھے اور خالی سے چہرے، پھرتے ہوئے فاصلوں کے تناؤ میں کھنچا ہوا آسمان پارہ پارہ

اکتوبر ۲۰۰۳ء / ۲۷

کہ ہر موج، اونچی ابواں چٹانوں کی مانند، ساقدار جتا افق ہے۔ سمندر کے افسانوی مرحلوں میں بڑی تھکی اور تھکائیاں ہیں

اندھیری شفق کے پرستان میں سرنگوں پر چوں کی اداسی؛ دلوں میں تحیر کہ اس ارغوانی بیاباں کے اس پار نہ جانے کتنے کنارے ابھی دھوپ سے ہوں گے اگلے مگر ہم مہم اور غربت کا آشوب سہتے، غنچتے دلوں اور دھواں و حار راتوں میں، بے خواب، سب منزلوں سے پرے ہیں۔

گھنے بن کے سائے میں آباد قریے کے گھر گھر میں روشن ہوئیں لائینیں؛

کہیں باغ میں کوئی لیتا ہے تانیں، چمکتے ہیں سنسان سڑکوں پہ جگنو ٹکٹے کو بے چاندندی کنارے، ہواؤں میں پھولوں کی خوشبو بسی ہے۔ ہمیں خواب میں آج دیکھیں گے کیا اوس اور چاندنی میں وہاں سونے والے؟

رلاتا ہے دن رات کڑوا دھواں سرخ آنکھوں میں گھٹ کر، ہوا کے تھپڑوں

کے ہمراہ موجوں کے اندھے تریڑے برستے ہیں، مگرتے ہوں مہتر جیسے

سیدو لے قرش پر چچ کھاتی ہے کف سے بھری ایک چادری ہر دم۔ افق، دھتتیں اور اجالے ہوئے ہیں ہمارے چراغوں کی لو میں مقید درختوں سے رستے لگا نہیں گوند، بن میں کھلے پھول اور سورما ہے نئے نیل بوٹوں کی رت کا چڑھا چاند، کھیتوں میں سرسوں نے سونا بکھیرا زمینوں کے سوائے رنگ اور حوصلے چیت کی دھوپ

کھا کھا کے جاگے، پطیس مگر سے پن چکایاں اور نہریں، چٹکیں اڑیں، چھپائے پرندے۔



وہاں کوئی بھی نہیں تھا

تبسم کا شمیری

وہاں کوئی نہیں تھا  
نہ چھپی نہ ڈھال نہ گھوڑا  
کوئی تیر انداز یا شمیر زن  
کوئی داستان گو  
یا کوئی مہم جو شہزادہ

وہاں وقت تھا  
نہ ساعتیں تھیں  
وہاں دن تھا نہ رات تھی  
سال، مہینے یا صدی  
وہاں کوئی کیلنڈر بھی نہیں تھا

ایک موسم جی تھی جو صدیوں سے چل رہی تھی  
رنگ کی ایک محراب تھی  
جہاں ہوا چل رہی تھی  
اور ایک خیمہ تھا  
جہاں کوئی سوراہا تھا  
اور ایک خریطہ تھا  
جس میں کوئی راز بند تھا

وہاں کوئی بھی نہیں تھا  
شاید کوئی بھی نہیں

یہاں ان اندھیروں میں، بدرنگ پرچم تلے، ناشتیدہ کناروں کی جانب  
عناصر کے زلزلے میں بے دست و پا اک شکستہ سفینہ بہا جا رہا ہے  
جھلکتی ہوئی دھوپ میں اور پیاسی زبانوں کے ڈھنڈا رہن جیسے صدیاں  
یہ مینہ اور بجلی کے طوفان ایسے کہ پھر عمر بھر جی لگے نہ ٹھکانے۔

کبھی ابر اور دھند کو چیرتی قرمزی صبح نے یادوں کا بہرہ پھر کر  
وطن کے مناظر میں بحری پرندوں کی براق پرواز سے جان ڈالی۔  
ہمیں کچھ بچانے کی نادان کوشش میں جھونکوں کی سرگوشیاں اور آہیں،  
نمک کی تھیں فرش پر، دھوپ پھیلی رہی دیر تک۔ دن مندا۔  
لالٹینیں۔

نہ جانے ابھی تک یہ حسرت بھری اک خلش سی ہے کیوں دل میں  
باقی ہمارے

کہ اپنی اتھاہ اور سر بہر یادوں کو اوروں کے دل کا اجالا بنادیں۔  
وہ بچپن کی باتیں، جوانی کے آدرش، بوجھ اس گھر کی، ہو لے،  
درتے،  
تراشیں ان ہیروں کو اس طور کیسے کہ ان کی ابد تک چکا چونہ پہنچے؟

لگنے اور پرانے درختوں کی چھاؤں میں قبروں کے آثار شاید ہوں  
اب تک!

وہ چہرے نکلتی تھی جن سے جلالت، وہ پر خوف آنکھیں وہ اثر دھات بازو،  
وہ محبت کے عادی، محبت کے خوگر، وہی لوگ بچپن میں دیکھا تھا جن کو،  
وہاں غنیمت اور خاموشی کے ابد میں اکیلے ہیں اور بے خبر سو رہے ہیں۔

کہاں ہیں وہ ارمان اور عزم، اسے دل، کہ ہم چھوڑ کر اس پرانے جہاں کو  
سمندر کے اس پار جائیں گے، نقشہ بدل دیں گے یکسر زمین آسمان کا:  
اچھوتی زمینوں سے سونا لگائیں گے، کھوئی ہوئی جنتیں ڈھونڈ لیں گے؟  
کہاں اب سفر کی وہ بھینسی سی خوشبو، وہ غیبی ندائیں، وہ ہالے، وہ سورج؟

ادھر یہ مہم جس میں آفاق گم ہیں، اندھیرے ہیں یا بیکراں خیرگی سے  
جہاں تازہ دم موت میں جتہ جتہ کسی نئی زیست کا ڈالنا ہے،  
کہ آخر ہمیں گے یہ فانوس اپنے سفر کے کسی آسمان کے ستارے  
امت ظلمتوں میں بڑے حوصلوں اور کڑی گردنوں کے نشان اور محور!



مراجعت کا ایک تجربہ

خیال کے لڑکھڑاتے پہنچے —

— یاد کا ایک در ماندہ سفر

بارشوں میں بھیکتے دن رات

بجلیوں میں چمکتی ہوئی

جامنوں والی ایک سڑک

بوندوں میں جلتی بجھتی لائٹیں

اور سرمئی پتھر کی ایک مسجد

پنچھی کا بسیرا

پرانے مسکنوں میں فاختاؤں کے گھر

آم کے بیڑوں میں لٹکتے گھونسلے

اور بچوں کی غلیلوں کا شور

وہاں کوئی ضرور تھا

وہاں کوئی تھا

اس نے میری طرح جھیل میں جال پھینکا

میری طرح ایک تیر چلایا

میری طرح مچھلی کھائی

اور میری ہی طرح ایک چہرے کو پیار کیا

وہ میری طرح دوڑ رہا تھا

میری طرح تیر رہا تھا

اور میری ہی طرح اسپ سواری کر رہا تھا

محرابوں پہ کھلتے گلاب

اور ہاتھوں پہ کھلتی چنبیلی

جھاڑیوں میں گھبرایوں کے غول

اور دو پہروں کو گرتی چھتیں

شاید سب کچھ ویسا ہی ہے —

— مگر خیال کے پیوں کا ضعف

اور یاد کے شیشوں پہ جمتی سیاہی —

یا پھر میری کہوت

باقی سب کچھ ویسا ہی لگتا ہے

گرما کی یہ تیز پیلی دھوپیں

سرخ اور گلابی کپڑوں سے لدی

— لمبی لمبی انگلیاں

— اور ایک گھر

چھتوں پہ ایک گمشدہ بادل

اور اس کی فریاد

چھجوں تلے ایک نایاب

مجھے یوں لگا کہ وہ میرے جوتے پہن کر چل رہا ہے

میرا پا جامہ پہن کر سو رہا ہے

میرا لباس پہن کر دفتر جا رہا ہے

اور میرا قلم پکڑ کر نظم لکھ رہا ہے

وہاں کوئی تھا

وہاں کوئی ضرور تھا



## سید امین اشرف

لرز رہا تھا فلک عرض حال ایسا تھا  
 فکشی میں زمیں کا سوال ایسا تھا  
 کمال ایسا کہ حیرت میں چرخ نیلی قام  
 شجر اٹھا نہ سکا سر زوال ایسا تھا  
 کسی وجود کی کوئی رقی نہ ہو جیسے  
 دراز سلسلہ ماہ و سال ایسا تھا  
 کھلا ہوا تھا بدن پر جراثیموں کا چمن  
 کہ زخم پھیل گیا امداد ایسا تھا  
 کبھی یہ تخت سلیمان کبھی صبا رفتار  
 نہ چڑھا تو سمند خیال ایسا تھا  
 گھرے ہوئے تھے جو ہادل برس کے محرم بھی گئے  
 بچا ہوا تھا جو تاروں کا جال ایسا تھا  
 کبھی وہ فعلہ گل تھا کبھی گل شعلہ  
 مزاج حسن میں کچھ اعتدال ایسا تھا  
 وہ آنکھیں قہر میں بھی کر گئیں مجھے شاداب  
 فروغ ہادہ میں رنگ جمال ایسا تھا  
 کسی سے ہاتھ ملانے میں دل نہیں ملتا  
 طلب میں شائبہ احتمال ایسا تھا

حلس پامالی کا طے کا  
 سریر آرا خزاں ہے کیا طے کا  
 چلو دشمن کو سینے سے لگالیں  
 کہاں اس شہر میں اپنا طے کا  
 نہیں بے وجہ اس گرداب میں ہوں  
 کنار آب بھی دریا طے کا  
 خراپ ہے کہ دشت نیوا ہے  
 کوئی زخمی کوئی پیاسا طے کا  
 مرے لشکر کی مٹی دوسری ہے  
 صف اعدا میں یہ بھی جا طے کا  
 نہیں بے سود ناز غم اٹھانا  
 حباب درد ہے دونا طے کا  
 امین اشرف کی ہے پہچان یہ بھی  
 بھری محفل میں وہ تنہا طے کا



## اسد محمد خاں



پکا ہے۔ اور اب جو ادا کی کرائے کے دو آنے پڑا کے سدا ان ادا۔ حوشی حوشی  
گھوڑا گاڑی سے اتر رہا ہے تو اہل میں وہ کوچیان کے بوٹ لیے جا رہا ہے۔  
ریورات نہیں۔

ہمیں بہت لطف آتا تھا۔ بڑی کھلی ہوتی تھی کہ سنا جب اپنی دکان  
پہنچے گا اور صندوق کی کا قفل کھولے گا تو اسے وہاں میر بھر سونے۔ بے سہاڑی  
بار بار سے بارہ آنے میں خریدے گئے نوئی بوٹ ملیں گے۔ مزو آنا یگا۔

سبکی، ستر اپنی جیب کتری، چوری چکاری اور مہنتی (اور شاید عورت  
بازی) کی کہانیاں سناتے ہوئے خود کو ایک عجیب منصف مزاج سوشلسٹ اور ایک  
انوکھے صاحب ایمان مسلمان کی طرح پیش کرتا تھا۔ یہ خوب شوق تھا اس کا۔ اپنی  
کہانیوں میں وہ کسی غریب ہندو مسلمان، سکھ، جیسا، پارسی، مل، مرہا، پھیر،  
والے کی جیب نہیں کاٹتا تھا۔ اور کسی ملک، اعتبار، سادہ کار، یعنی اصول و  
مسلمان ہو... ہرگز نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ اس کا شمار دولت مند ہوتے تھے۔  
وہ بھی ایسے جن کے بارے میں اسے معلوم ہوتا تھا کہ اسے 'سوانح' جانتے  
ہیں۔ اس کے سوا، ستر میں دھرم کا جید خدا نہیں رہتا تھا۔ نہ!

ہم لڑکوں کی موجودگی میں ہمیشگی ماشٹر کو اپنی عورت بازی کے بیان سے  
سرسری رہ گذرنا ہوتا تھا۔ تاہم سے اسے مسیروں کی آنکھوں کی پتک اور ماشٹر  
کے رجز یہ انداز میں سر ہلانے سے ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس وقت جو کبھی ماشٹر اس  
ہندو عورت کو سمجھا بھگا کے اپنی کھولی میں لے جا رہا ہے تو بے شک اب یہ اس کے  
ساتھ سونے گا۔

ہمیشگی میں زندگی کرنے کے دوران جو مسلمان عورتیں رہیں، شادی، شادی  
کے راستے میں آئیں، ماشٹر انہیں رازم میں، بٹھا کے صابو صندیق کی سرائے کے  
ساتھ چھوڑ آتا تھا۔ اسے اس کے بیٹے (ایہ سائے اپنے مسلمانوں کی  
سرائے سے) سے شک واپنی ضرورت نہا سکیں سوتا ڈاڈا اور دھنتی ہے۔

میں ہمیشہ سے یقین لے رہی تھی کہ ماشٹر، ماشٹر، ماشٹر (جیسی  
بیان کر رہا ہوتا) کی طرح مان لینے میں مجھے کوئی پریشان کن سوانح تھی۔ ماشٹر سے  
ایک ڈیڑھ سال چھوٹا میرا بھائی ماشٹر کی اپنی بیان کردہ نیکیوں پر، مل میں اعتبار نہیں

ہر کہانی لکھنے والے کے پاس اودھ لکھی ادھوری کہانیاں ہوتی ہیں۔

میرے پاس بھی کئی ادھوری کہانیاں ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کا مجھے خیال  
رہتا ہے کہ ہمیں کہیں اس پاس موجود ہیں۔ کیا خبر اور بھی ہوں، کئی ہمیں۔

بعض کہانیاں لوش کی صورت میں ہیں۔ کچھ لوش کئی سطحوں پر پھیلے  
ہیں۔ کچھ کم پر۔ یعنی تو بہت ہی مختصر ہیں۔ ایک ڈیڑھ سطر کے ہوں گے۔ ایک حد تو  
صرف پانچ لکھے ہیں کرائے دار، بیس کی مال، ہر مذہب، ہر ادب۔

یہ مانگوں سے معذور، اپنے وقت کے مشہور جیب کترے اور نو سر ہاڑ  
"ہمیشگی ماشٹر" کی کہانی کے لوش ہیں۔

ان میں 'ہو پ' کا لفظ انوکھا ہے۔ باقی مل، جیسا کہیاں، کرائے دار  
اور مرشد، یہ سب پہچانے ہوئے لفظ ہیں۔ 'ہو پ' ایک طرح کی آواز ہے۔

تو اب دیکھیے ان لفظوں کی مدد سے ماشٹر کو اور اس کی سنائی ہوئی سلسلی  
خیز کہانیوں کو یاد کرنے کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔

ہمیشگی ماشٹر ہمارے پشتینی مکانات میں سے ایک بہت چھوٹے مکان  
میں اپنی بیوی اور سات آٹھ برس کی بیٹی کے ساتھ کرائے سے رہتا تھا۔ وہ ہم لڑکوں  
اور بعض مسالوں کا ایک دم "ذاتی" داستان گوتھا۔ اسے کہیاں سنائے کے ساتھ  
کہانیاں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔

وہ خود کو بلند آواز میں اسامی تواریخی ناویں اور بہرام ڈاکو کی کہانیاں  
پڑھ کے سنا کرتا تھا۔ اور حسب ناویں اور کہانیاں نہیں پڑھ رہا ہوتا، اور ہم لوگ  
مناسب تھا، میں اس پاس موجود ہوتے تو وہ خود اپنے معرکوں کو بارے میں بتاتا  
کہ کس طرح اس نے رازم میں بیٹھے بیٹھے سٹ ہر میں ایک مارواڑی سینکھ کی کیش کی  
حصیلی اڑائی تھی اور کس طرح اس نے اس پیسے سے گوا، اور سری نگر، اور امیر ٹریف  
میں مزے کیے تھے اور کس طرح وہ ایک بار درگاہ حاجی ملی جانے کے لیے انتہائی  
گھوڑا گاڑی میں آگے کوچیان کے پاس چا میٹھا تھا تو اس سے رستے سے سوار سوار  
اور اتر جانے والے ایک سنا کی صندوقچی سے کوئی میر بھر سونے کے ریورات  
اڑا لیے تھے اس مہارت کے ساتھ کہ سنا کو پتہ چلا کہ ریورات چاچکے ہیں اور نہ  
کوچیان کو معلوم ہوا کہ ماشٹر اس کے درنی نوئی بوٹ مال، جی کی صندوقچی میں مال



کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا بلکہ یقین تھا اسے کہ ماسٹر نے مسلمان حاجیوں تک کی جیسے کاٹی ہوں گی اور موقعہ ملنے پر مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی وہی سب کیا ہوگا جو وہ ہندو عورتوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ ماسٹر مجھوت بولتا ہے، یا اس نے وہ کیا ہے جسے لوگ کرتے رہتے ہوں گے اور بتاتے نہیں، یا اپنی چوری چکاریاں بیان کرتے ہوئے وہ مسکرائے جاتا ہے۔ جیسے چوریاں نہ ہوں میں سا ہو کاریاں ہو گئیں، جیسے کھڑوں میں کشتیاں جھتی ہوں، ماسٹر نے۔

مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں تو اتنا جانتا تھا کہ ماسٹر کی کہانیاں مجھے اجماعی تھیں۔ سال بھر پہلے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں آیا تھا وہ ہم بڑے کوئی آٹھ مہینے سے کسی کو بتائے بغیر، چپکے سے جا کے اس کی کہانیاں سن پیتے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو معلوم تھا کہ گھر والوں سے ہمارے آنے کا ذکر بالکل نہیں کرنا ہے۔ کیوں کہ گھر والوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ ہم ماسٹر کے گھر آئیں جائیں یا اس کی کہانیاں سنیں یا محلہ والوں کے ساتھ انھیں بیٹھیں۔

ماسٹر بیڑی بناتا تھا۔ اس کی بیوی اجرت پر گھر سنبھالنے والی 'موگانی' تھی۔ یہ ماسٹر نے ہمیں بتایا تھا (گھر والے کہتے تھے وہ کہیں پیسے والوں کے وہاں کھانا پکاتی ہے۔)

تو کھانا پکانے میں کیا ہے؟ اگر کسی موگانی نے پیسے والوں کا کھانا پکا دیا تو کیا ہو گیا؟ کسی کو تو پکایا ہوتا ہے کھانا۔ (اور یہ پیسے والی بات ابھی ہمارے ذہن میں ٹھیک سے نہیں آئی تھی۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ کچھ لوگوں کے پاس پیسے ہوتے ہیں، کچھ کے پاس نہیں ہوتے، یا کم ہوتے ہیں۔ تو اس سے کسی کو کیا؟)

گھر والوں کو یہ بھی کہتے سنا تھا کہ ماسٹر اور اس کی بیوی کچھ تھپلا کر رہے ہیں۔ کوشش کرنے پر بھی ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کیا تھپلا کر رہے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ ہو سکتا ہے گھر والے ماسٹر کو یہاں سے چلا کر دیں۔ میرے پھو نے بھائی نے اپنے طور پر کچھ پتہ لگانے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی زیادہ صاف نہیں ہو پایا تھا۔ مطلب اسے شک سنا تھا کہ ماسٹر کی بیوی کے ساتھ دوسرے لوگ سوتے ہیں۔ بکو اس بات تھی اسوتے ہیں؟ ہاں، کبھی ہو سکتا ہے بھلا؟ ماسٹر دوسرے لوگوں کو پھری نہیں مار دے گا؟

خیر۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر ہم لوگوں کو زیادہ کچھ غور کرنے کا شوق نہیں تھا (میرے پھو نے بھائی کو تھا۔ مگر اس کی بکواسوں پر اکثر میں اسے ڈانٹ دیتا تھا۔)

محلے میں ایک اچھے آدمی اوسمیاں رہتے تھے (ہم انھیں نیزمی گردن

والے اوسمیاں بودپ کہتے تھے)۔ یہ بہا، بیکار سا نام ہم ہی نے رکھا تھا۔ اوسمیاں چوری مریدی کرتے تھے۔ اس کی گردن نیزمی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے بودپ کی آواز نکالتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے اپنے موکل کو یا کسی کو بلا دیا ہوگا۔ اس سے ہیں۔ اوسمیاں نے بھی ماسٹر کو بھی مرید بنایا تھا۔

ماسٹر اکثر بڑے جذبے کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا تھا کہ بھو اوسمیاں صاحب نے بھٹکے ہوئے ماسٹر کو کسی رستے پہ لگا دیا ہے نہیں تو ماسٹر "جہنمی" مارا گیا تھا۔

پتہ نہیں وہ خود کو "جہنمی" کس بات پہ بہتا تھا؟  
باقی کہانی زیادہ چھوٹی جی سکتی ہے۔ ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں بتایا کے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ میں دن بعد لوٹنے تو دیکھا کہ ہمارے جس مکان میں ماسٹر رہتا تھا اس میں اب گھاس کا بیو پارہ رہتا ہے اور سانسے والے میاں (نیزمی گردن والے اوسمیاں بودپ) کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی تو ہمیں پروا نہیں تھی، ہاں، ماسٹر کے جانے سے ہم لوگ بے مزہ ہو گئے تھے کہ وہ سب سنسنی والی کہانیاں اب سننے کو نہیں ملیں گی۔

دوسرے روز میرا چھوٹا بھائی عجیب کہانی نے کے آیا۔ بتانے لگا کہ ماسٹر اصل میں کہیں شفٹ ہیں ہوا ہے، جیل میں ہے۔ اس نے نیزمی گردن والے اوسمیاں بودپ کی گردن میں چھری ماری تھی اسی سے اوسمیاں مرے ہیں۔ بھائی بتانے لگا کہ پہلے پہل تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں دھوبوں کے لڑکوں نے بتایا کہ رات میں کسی وقت ماسٹر کی بیوی جب اوسمیاں بودپ کے بے تیغے چادلے کے گئی تو اوسمیاں نے اس پر بڑے ارادے سے ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چیخنے لگی تو ماسٹر جیسا کہیوں کے سہارے اچھلتا ہوا سڑک پار کر کے بودپ کی بیٹھک میں پہنچا جہاں اس نے وہ سب دیکھا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اوسمیاں نے کتنی بار بودپ بودپ کی، مگر بیوی کی بات ٹھیک تھی تو بس ماسٹر نے نیزمی گردن والے بودپ کی گردن پہ چھریاں ہی چھریاں ماریں اور اسے ختم کر کے سڑک پہ آ کے بیٹھ گیا۔ اور رونے لگا۔ دھوبوں کے لڑکے خود حیران ہو رہے تھے کہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ رو کیوں رہا تھا ماسٹر؟ اور اوسمیاں بودپ کو اس نے چھریاں کائے کو ماری تھیں؟ لڑکے کہہ رہے تھے کہ ماسٹر خود ہی تو اپنی عورت کو چلاتا تھا، ایک اوسمیاں کے ہاتھ پکڑنے سے کون طوفان آ گیا تھا؟

پھو نے بھائی نے بتایا کہ دھوبوں کے لڑکے طوفان کو "طوفان" کہہ رہے تھے۔

جال سالے! ☆ ☆ ☆



تری جدائی میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے  
کہیں پہ تو کہیں تجھ سا دکھائی دیتا ہے

زمانہ ہو گیا ایسے کسی سفر میں ہوں  
کہ اب نہ موڑ نہ رستہ دکھائی دیتا ہے

الجھری ہے بہت مجھ سے میرے پاؤں کی گرد  
قدم قدم پہ تماشا دکھائی دیتا ہے

عجیب وقت سنو! آپڑا ہے سورج پر  
طلوع ہوتا نہ ڈھلتا دکھائی دیتا ہے

یہ میری آنکھیں نہیں دوسروں کی آنکھیں ہیں  
اندھیرا ہے یہ اجالا دکھائی دیتا ہے

ایک ہی دھن ہے کس مات کو ڈھلتا دیکھوں  
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو ٹکنا دیکھوں

اے جنوں تجھ سے تقاضا ہے یہی دل کا مرے  
شہر امید کے نقشے کو بدلنا دیکھوں

یہ سرودہ ہے کہ رکنے کا مقام اس میں نہیں  
میں جو تھک جاؤں تو پرچہ نہیں کو چلتا دیکھوں

چاہے تاریکی مخالف ہو، ہوا دشمن ہو  
مشعل لہو کو ہر حال میں جلتا دیکھوں

وصل آثار کوئی لمحہ میسر آئے  
ہجر کی ساعت بے مہر کو ٹکنا دیکھوں



جانتی سنگھوں سے جن خوابوں کو بھٹاتا ہے وقت  
 کتا ہے کتا ہے ان کی خود تعمیر بن جاتا ہے وقت  
 کوئیوں کو دھوپ کے شعلوں میں جھلساتا ہے وقت  
 اور جیسے بڑ پر خیم بھی برساتا ہے وقت  
 دور ہی سے کھیلتا ہنستا گذر جاتا ہے وقت  
 ہم فقیروں کے قریب آنے سے کتراتا ہے وقت  
 پھر کسی خوابیدہ فتنے کو جگا جاتا ہے وقت  
 شورشِ شام و سحر میں جب کی پاتا ہے وقت  
 وقت ہی صبحِ مسرت وقت ہی شامِ الم  
 نت نئے بہرِ پھر کر سامنے آتا ہے وقت  
 بستیاں خود ہی ہساتا ہے مگر پھر ایک دن  
 بستیوں کو روند کر آگے چلا جاتا ہے وقت  
 غم کی دیواریں اٹھاتا ہے کہ سر پھوڑے کوئی  
 اور پھر خود ہی یہ دیواریں گرا جاتا ہے وقت  
 بھول جاتا ہوں کہ سورج بن کے برسا یا تھا قہر  
 چاند بن کر جب مری چھت پر اتر آتا ہے وقت

ٹوٹ جانا اور بکھر جانا دلوں کا دفعتاً  
 آگینے ہیں جنہیں پتھر سے ٹکراتا ہے وقت  
 ساعتوں کے پہ کھلونے ہیں مرے کس کام کے؟  
 ایک بچے کی طرح کیوں مجھ کو بہلاتا ہے وقت  
 لے کے آ جاتا ہے گذرے واقعوں کو سامنے  
 کچھ پرانے روز و شب ہیں جن کو دہراتا ہے وقت  
 ہر نفس اک معجزہ ہے جینے والوں کے لئے  
 کون سمجھے گا یہاں کس کو یہ سمجھاتا ہے وقت  
 دو گھڑی رک کر کہیں ہم خود سے مل سکتے نہیں  
 عمر بھر ان راستوں پر ہم کو بھٹاتا ہے وقت  
 اس طرف سے پھر کوئی رستہ کہیں جاتا نہیں  
 زندگی کو دیر سے دیر سے جس طرف لاتا ہے وقت  
 وقت کی آہٹ سے اے مختور گھبراتے ہیں سب  
 میکدے کی راہ سے گذرے تو گھبراتا ہے وقت



میں نے اپنی روح کو اپنے تن سے الگ کر رکھا ہے  
یوں نہیں جیسے جسم کو پیرا بن سے الگ کر رکھا ہے  
مرے لفظوں سے گزرو، مجھ سے درگزر کرو کہ میں نے  
فن کے پیرائے میں خود کو فن سے الگ کر رکھا ہے  
فاتحہ پڑھ کر یہیں سبک ہو لیں احباب، چوہدرنہ  
میں نے اپنی میت کو دفن سے الگ کر رکھا ہے  
گھر والے مجھے گھر میں دیکھ کے خوش ہیں وہ یہ کیا جانیں  
میں نے اپنا گھر اپنے سکون سے الگ کر رکھا ہے  
عمر کا رستہ اور کوئی ہے، وقت کے منظر اور کہیں  
میں نے بھی دونوں کو بہم بچپن سے الگ کر رکھا ہے  
اس پہ نہ جاؤ کیسے کیا ہے میں نے خود کو خود سے الگ  
بس یہ دیکھو کیسے کیسے اذیتیں پن سے الگ کر رکھا ہے  
درد کی کتنی سلجھانے پھر کیوں آئے ہو خرد والو  
بابا ہم نے تم کو جس الجھن سے الگ کر رکھا ہے؟

اب مسرت روح پر چھاتی نہیں  
آتش غم دس کو چھاتی نہیں  
ایک سی ظلمت، کہ ظلمت کیا کہیں  
رہشیں ضد جس کی کہاتی نہیں  
شور نے یوں کر دیا ہے بے حجاب  
خاموشی سی ہے پسند آتی نہیں  
یہ قہقہے، یہ تھن، یہ سہاڑ  
ور یہ کہ روح مہجاتی نہیں  
یہ مجھے اپنے بچپن کے ہندو  
جن سے اب کوئی صدا آتی نہیں  
تھل کے مرجا سے نہ قید جاں میں است  
کب سے چوہ چتی نہیں صحت نہیں  
چمپہ سے ہم ہر منی سار اسل  
زندگی کی منی — جاتی نہیں



## طاقت

طاقت ہی اک زبان ہے جس کا کوئی بھی لفظ  
مہمل نہیں، غریب نہیں، بے اثر نہیں  
روز ازل سے آج تک اس کے فیصلے  
دانش کی ہر دلیل یہ حاوی رہے ہیں اور  
اس کے لکھے کو کوئی قلم زندہ کر سکا

ماضی میں اور آج میں بس اتنا فرق ہے  
مہلے جو زور آور تھے وہ سب اپنے فیصلے  
لگتے تھے نوک تیغ اور بہتے لہو کے ساتھ  
اور آج کے جو جابر و عالم پناہ ہیں  
ان کے لبوں پہ رہتی ہے روشن سدا ہنسی  
ریشم سے ان کے لفظ ہیں، خوشبو سی گفتگو  
مطلوب کوئی فرد ہو یا قوم ہو کوئی

جینے کا حق یہ چھینتے ہیں، اور اس ادا کے ساتھ  
جیسے جہاں میں عدل کی حرمت اسی سے ہو  
جب چاہیں ختم کر دیں یہ نقشے سے وقت کے  
ٹپ بھر میں جیتی جاگتی بستی کا ہر نشان  
اپنے وطن میں اپنے ہی گھر میں نہ رہ سکیں  
ہیں لوگ ان کے واسطے کاغذ کی کشتیاں  
اگلے دنوں میں کرتے تھے تیغ و تیر سے قتل  
یہ پھونکتے ہیں آگ میں آباد بستیاں

دانشوری اور عدل کا جہ چاہے ہر طرف  
ظالم کا ظلم روکنے والا کوئی نہیں  
تاروں کا راز داں ہوا انسان کا دماغ  
قاتل کو اب بھی ٹوکنے والا کوئی نہیں

## آیتین (۱) کے لئے ایک نظم

ابھی تو اتنی نازک اور چھوٹی ہے وہ  
کہ اسے اٹھاتے ڈر لگتا ہے۔

اس کے لبوں پر کھلنے والی  
پیاری سی مسکان ہے ایسی  
جس میں آہ زاد منصب کی رفعت کی  
ضورتی ہے

اس کے ننھے ہاتھ کے لمس میں جھلتی ہے  
اس راحت کو اب لفظوں میں لاؤں کیسے

ایسی زندہ کیفیت کو ظاہر کرنے والی زبانیں  
ابھی کہاں بن پائی ہیں  
میرے بلانے پر وہ مجھ کو ایسی نظروں سے نکلتی ہے  
یوں لگتا ہے جیسے اس کو ساری بات سمجھ آتی ہے

سو، جیسے اس بچی کا نام ہے آیتین  
اس کی ہنسی میں روشن رکھنا سارے گھر کا چین

غمخیز گیا ہے سر آئینہ مرا پر تو  
 یہ سوچ کر کہ یہاں کوئی بھی نہ رہتا ہو  
 وہ آفتاب ابھی تک مرے لبو میں ہے  
 چلا ہے دھوئے نے جس کو ستارہ شب رو  
 زمیں کے بھول لب صدف کے استعدادے ہیں  
 عجیب سیر ہے گھر سے نکل کے دیکھو تو  
 کنار آب سینہ ہے خنجر کوئی  
 جو ہو سکے تو اسی لہر کو کنارہ کر دے  
 پس مڑہ کنی مہتاب جھللاتے ہیں  
 کچھ اور دور اسی روشنی میں ساتھ چلو  
 اگر ہے زندہ تو ہونے کا کچھ جواز تو دے  
 جو کامگار نہیں ہے تو نقشِ عبرت ہو  
 حیاتِ ڈوب چکی درد کی سیاحی میں  
 اب ایک رنگ ہے تصویر ہو کہ پردہ ہو  
 ابھی یہ روشنیاں تیز ہو کے گل ہوں گی  
 ابھی تو وسط تماشا ہے دیکھتے جاؤ  
 سمجھتی ہے اسے موجِ رواں ہنر اپنا  
 تراشا ہے کوئی اور سنگ دریا کو



بہار خوش دے نہ پھیرے میں  
 بہت دن ہیں ابھی موسم بدلنے میں  
 کسی ٹوٹلے دیپک راگ کا یہ ہے  
 دپ جئے کئے ہیں پتے پتے میں  
 بہت دیکھنے کو ہے ابھی باقی  
 کبھی آیا نہیں میں اس واسطے میں  
 سے بھی قوت بازو سے پدا ہے  
 زمیں آئی نہیں تھی میرے جسے میں  
 رہے گی وصل کے امکان تک روشن  
 بھڑکتی ہے جو مشعل میرے سینے میں  
 کبھی آنکھوں میں اس سیمیں بدن کی تھی  
 چھپی ہے آج جو تنویر تارے میں  
 ابھی سے فکر کیوں رہنے لگی دل کو  
 بہت سادقت باقی ہے پگھلنے میں  
 مجھے اپنی جھٹک دیتے چلے جاؤ  
 اندھیرے میں کبھی آکر اجالے میں  
 ازل کے دن سے وہ شامل رہا ساجد  
 کسی صورت مرے ہونے نہ ہونے میں

حسین زیادہ ہے یوں جب سفر زیادہ نہیں  
 جنہیں خبر ہے انہیں بھی خبر زیادہ نہیں  
 وہ راستے وہ مسافر سراپ خواب تھے کیا  
 کھلی جو آنکھ تو دیکھا شجر زیادہ نہیں  
 ملاں جی کا گذرتی ہوا سے کیا کہتا  
 مول ہوں کہ مرے نامہ بر زیادہ نہیں  
 کھی مٹی ہے مگر کس قدر تکلف سے  
 ہوائے موسم گل رنج بر زیادہ نہیں  
 غمیں نہ ہو کہ ترے حال زار پہ وہ نظر  
 چھہ سی تم بھی نہیں ہے، اُتر زیادہ نہیں  
 ہوا کے جن تھے غرقاب ساحلوں کے قریب  
 ہوا وہی ہے مگر لوحہ گر زیادہ نہیں  
 خیال وسعت ہفت آسماں کو چھان چکا  
 بقدر وہم مرے دشت و در زیادہ نہیں

نہ ہوگی اور کسی چیز کی طلب اس کو  
چراغ ساتھ لئے پھر رہے ہیں جب اس کو

زباں کے ساتھ ہیں محو کام آنکھیں بھی  
بات آخر آئی گیا دل لگی کا ڈھب اس کو

کی سال میں بہتا ہے وہ گلاب اب تک؟  
کسری طرح بھلائے ہوئے ہیں سب اس کو

کبھی کسی کے مقابل نہیں جو آپا  
کیا ہے میں نے بہر طور منتخب اس کو

کبھی تو آئے گا اس گل بدن کو دھیان مرا  
کبھی تو راہ پہ لائے گا میرا رب اس کو

ہے اس کے دل میں اترنے کی آرزو اب بھی  
نہیں کہ مجھ سے شکایت ہے بے سبب اس کو

شروع مجھ سے ہوئی رسم عاشقی ساجد  
کہ مجھ سے پہلے کوئی چاہتا تھا کب اس کو

محبت ٹوٹ کر جس سے کبھی کی تھی اسی سے جنگ کی ہے  
بہر صورت زمیں ہم نے بہت اک دوسرے پر تنگ کی ہے

بہت سے راز ہیں جن کا بیاں کرنا بہت آساں رہے گا  
مجھے پروا مگر کچھ چاہنے والوں کے نام و تنگ کی ہے

بجا ہے مگر کسی کو زعم ہے اپنی مباحث کا، اگر چہ  
ہیں آئینہ جتنی روشنی ہے سب چراغ رنگ کی ہے

پشیمیاں اپنی حالت پر وہیں چھوڑا تھا دنیا کو کسی دن  
کہ یہ شے ہم نے اپنے ساتھ رکھی ہے نہ اس کے تنگ کی ہے

نظر اصل حقیقت پر نہیں پڑتی ہے میری بھول کر بھی  
کہ اک چادر ابھی تک میری آنکھوں پر طلسمی رنگ کی ہے

کبھی الزام کوئی آئینے پر اور فطرت پر نہ دیں گے  
وہ کہتے ہیں مری دنیا کسی رنگیں ادا نے تنگ کی ہے

سریلی گھنٹیاں بجتی سنائی دے رہی ہیں آج ساجد  
صد امیرے تعاقب میں ابھی تک اس پری کے چنگ کی ہے



پار اتار کر مجھے ناؤ کو ڈبو گیا  
واپسی کا راستہ غرق آب ہو گیا  
بحر فرط جوش میں ہم کنار ہو گیا  
اپنے اک اہال سے لب مرے بھگو گیا  
میں نہیں سمجھ سکا کون سا زیاں ہے یہ  
جو کبھی ملا نہیں رنج ہے کہ کھو گیا  
کھوٹ کچھ لگا مجھے اس کے ہر خلوص میں  
آڑ میں وہ پھول کی خار سا چھو گیا  
نیند جب سوار ہو وقت کیا مقام کیا  
چلتے چلتے میں کہیں راستے میں سو گیا  
خار و خس کی ذات کا علم تھا اسے ضرور  
کاٹنا محال ہے ایسی فصل بو گیا  
سرجھکا کے راہ میں بیٹھنے سے یہ ہوا  
نا توں سمجھ کے وہ بوجھ میرا ڈھو گیا

کہیں بھی سانس لیں ہم ہوا ہر جا بھم ہے  
نہ پوچھو اس کی قیمت جو بے دام و درم ہے  
انی بر چھی کی اس کی مری نوک قلم ہے  
اتر جائے جو دل میں وہی ان میں اہم ہے  
جو رکھا تھا زمیں پر مرا پہلا قدم تھا  
پڑا ہے چاند پر جو مرا اگلا قدم ہے  
مے لکڑوں کو ٹھنڈک جلن آنکھوں کی کم ہو  
چلیں ہم پا برہنہ جہاں تک گھاس فم ہے  
خوشی سے بچ دیں گے جگر کیا جان اپنی  
بہت ایسے ملیں گے جنہیں جینے کا غم ہے  
نخی کا لیکھا جو کھا جو رکھتا ہے وہ جانے  
مدد میں دس لکھا ہے صلے میں سو رقم ہے  
مرے ہر پل کی اس کو خبر رہتی ہے راہی  
اگرچہ اس کی جانب توجہ میری کم ہے

## غزل

نلامہ نفسی راہی

وہ راہ جو پر خطر نہیں ہے  
اس میں بھی مرا گذر نہیں ہے  
ہے ناز قصیں کس آگہی پر  
ہمسائے کی جب خبر نہیں ہے  
سب راکھ ہوا بس اب کوئی دم  
اک آنچ کی بھی کسر نہیں ہے  
اتنا ہے خیال چلتے چلتے  
یہ اکوئی ہم سنہ نہیں ہے  
اب جائے ہوئے ہیں تہیں ہم  
دریا میں جب گہر نہیں ہے  
ترتیب سے حسن ہے جہاں کا  
اک چیز ادھر ادھر نہیں ہے  
رکھتے تھے توقعات جس سے  
اس نوع کا یہ بشر نہیں ہے

کیا بات سے جو گلی میں اس کی  
اے خاک ترا گذر نہیں ہے  
بھایا نہ ہمیں بھرا پرا شہر  
خالی یہاں کوئی گھر نہیں ہے  
رکھے وہ لحاظ فاصلے کا  
کمزور مری نہ نہیں ہے  
اے بحر بے کنار، تیری  
اک بوند میں بھی اثر نہیں ہے  
اب دار ہے تو ایپ در پر  
کاندھے چھوڑی کا سر نہیں ہے  
اب دور نکل چکا ہے اتنا  
بندے کو خدا کا ڈر نہیں ہے  
وہ شہر ہے فتح پور جس میں  
اسی تو ہے رنگدہ نہیں ہے



## غزل

### کرشن کمار طور

ہے دونوں آنکھوں کا شاید نشانہ ایک طرف  
جو میں ہوں ایک طرف تو زمانہ ایک طرف

یہی بہت ہے وفا کی دہائی دیتے رہو  
جو ہونے والا تھا آخر ہوا نہ ایک طرف

میں اپنے آپ گھلا جا رہا ہوں اندر سے  
گراں ہے گردش رسم شبانہ ایک طرف

کوئی جہاں میں خریدار ہی نہیں اس کا  
ہے بیش قیمتی غم کا خزانہ ایک طرف

میں طلق کرتا ہوں خود کو یہاں کہیں نہ کہیں  
سلوک دہر ہے کچھ غائبانہ ایک طرف

یہ وہ دیا ہے جو دن میں بھی جلتا رہتا ہے  
ہے شام ہی سے غم کر بلا نہ ایک طرف

کہیں بھی جاؤں ہے ہجرت مرے مقدر میں  
میں ہر علاقے سے ہوں اب روانہ ایک طرف

تمہارے عشق میں کیسا یہ منحصر ہے طور  
اتانہ دونوں ہی جانب اتانہ ایک طرف





خواست اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے ایک نوجوان مرد اور اسی عمر کی ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا تو نوجوان بولا۔

”آپ نے برا تو نہیں متایا؟ دراصل ہم لوگ بور ہو رہے تھے، سوچا آپ سے کپ شپ لگا ل جائے۔“

اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر کیا اور فوراً بولا۔ ”نہیں نہیں، میں تو خود بور ہو رہا تھا۔ آئیے آپ لوگ اندر آئیے نہ۔“ وہ ایک طرف ہو گیا۔

”یہ میری بیوی ریحانہ ہے اور میں قدوس ہوں۔“ نوجوان اندر آتے ہوئے بولا۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے، وہ بستر کی پائنٹی پر تنگ گیا۔

”آپ آرام سے لیٹے رہئے، کچھ تکلف نہ کیجئے۔“ ریحانہ بولی۔ وہ نیم دراز ہو گیا۔

مجھے تو اکیلے میں بڑا لگتا ہے، قدوس کہنے لگا۔

”یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی؟“ خوشی کے مارے اس کے منہ سے لفظ نہ نکل رہے تھے۔

ہاتھ شروع ہو گئیں، دنیا بھر کی باتیں، گھروں کی، دفتروں کی دوستوں کی معلوم نہیں کب وہ اونگھ گیا۔

صبح آگے کھلی تو وہ ہشاش بشاش تھا۔ مہماں دونوں کب کے جا چکے تھے ”شاید میں سو گیا اور وہ چپکے سے چلے گئے۔ بڑے شریف لوگ تھے۔“

ڈانگ ہال میں ناشتہ کرتے ہوئے اس کے میزبان نے پوچھا۔ ”رات تو آرام سے گزری؟“ پھر ہنسنے ہوئے وہ بولا، ”ڈر تو نہیں لگا

آپ کو، کیوں؟“

”نہیں، ہانکل نہیں۔“ اس نے توس پر ٹھنک لگاتے ہوئے کہا۔ ”پڑوس والے کمرے سے قدوس صاحب اور ان کی بیگم آ گئے تھے۔“

میزبان نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ساتھ والے کمرے سے؟“

”جی ہاں، ساتھ والے کمرے سے، بڑے ساجھے ہیں دونوں میاں بیوی۔“ میزبان لہو بھر چپ رہا پھر بولا۔

”لیکن... لیکن ساتھ والا کمرہ تو خالی ہے۔“

”خالی ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن قدوس صاحب اور ان کی بیوی تو...“

”گزشتہ سال وہ دونوں اسی کمرے سے تھے۔“ وہ کچھ رکتا ہوا بولا۔ ”رات کو گیس کا بیڑ کھلا رہ گیا تھا، بے چارے دونوں...“ میزبان چپ ہو گیا۔

لو بھر تو اسے کچھ کچھ میں نہ آیا۔ پھر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آیا، جھپٹ کر اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔

ساتھ والے کمرے میں جانے والے دروازے کی کنڈی اندر کی طرف لگی ہوئی تھی ☆ ☆ ☆

کولکتہ چارنک (Job Charnock) کی وہ

کشتی جو اپنے جاوداں سفر پر رواں دواں

ہے۔ اس کشتی پر سوار بہت سارے مسافر

سماج کے حاشیے پر زندہ ضرور ہیں، مگر

سماج پر جن افراد کا قبضہ ہے کیا وہ

صحیح معنوں میں ان عناصر پر فیصلہ

دینے کی سند رکھتے ہیں؟

## چارنک کی کشتی

آج کے ادب کا ایک منفرد نام

بلند پایہ جدید شاعر اور افسانہ نگار

## صدیق عالم

کا منفرد اور ناقابل فراموش ناول

نثری نظم کی ہیئت میں

صفحات : ۴۳۴ قیمت : ۱۵۰ روپے

INSHA PUBLICATIONS

25-B, Zakaria Street,

Kolkata-700073

شب خون کتاب گھر

سے بھی دستیاب ہے

گفتار سے آگے کہیں کردار سے آگے  
اک شخص ہے مجھ میں مرے افکار سے آگے  
یہ جستجوے لوح و قلم اس کے لئے ہے  
وہ شے کہ بہت ہے مرے اشعار سے آگے  
جاگیر مری دور تک پھیلی ہوئی ہے  
میں دیکھ رہا ہوں فقط آثار سے آگے  
دریا تو ہے اک مرحلہ شوق و گرنہ  
مقصود سفر ہے کہیں اس پار سے آگے  
دیوار میں دروازہ اچانک نکل آیا  
سایہ سا کوئی تھا حد اسرار سے آگے  
کے شوق کی تفسیر کی مرل سے پہلے اور  
اک طرز قلم لب اظہار سے آگے  
یہ آبلہ پائی تو مرا عزم سفر ہے  
جاء ہے مجھے وادی رخاں سے آگے  
میں خول سے باہر جو نکل آیا تو دیکھا  
کچھ اور بھی دنیا مرے پندار سے آگے  
اس دھوپ میں سایہ مجھے درکار تھا بیتاب  
پھر کیا ہوا میں چل دیا دیوار سے آگے

بت کدوں سے بتوں سے آگے ہے  
وہ بھی سرحدوں سے آگے ہے  
وہ بدستار ہے ہر زمین غیب  
اور ان بادلوں سے آگے ہے  
اے صبا وہ بہار ہے نہ خزاں  
ان بھی موسموں سے آگے ہے  
ایک پرواز ہے مگر شاہین  
وہ تمھارے پروں سے آگے ہے  
عشق بھی ایک زاویہ ہے مگر  
جسم کے زاویوں سے آگے ہے  
راہ کے یہ فریب ہیں سارے  
شوق ان منزلوں سے آگے ہے  
اک صنوبر ہے میری یادوں میں  
نہیں ان جنگلوں سے آگے ہے  
وہ اکیلا سفر میں ہے بیتاب  
مگر ان قافلوں سے آگے ہے



## نظمیں

## شاہین

## نوحہ

## غزہ ۲۰۰۳

میری زبان رچل وردی *Reich* کی یاد میں حس  
 ۲۸/۱۰/۲۰۰۳ کو غزہ سے اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا کہ  
 میں یہ حد تک تنہا محسوس کرتا ہوں کہ یہاں بہت عجیب حالات ہیں  
 مگر میں اپنی ساری باتیں یہاں سے کہتا ہوں۔ وہ یہ صلاحیت رفت  
 ہے کہ میں یہاں سے اپنے لکھنے والے کو یہ نیلی ہار جیت پسندوں  
 سے پتہ نہ لگے کہ میں وہ ایک بلند درجے کے چھوٹے گڑھاں ہوں۔

بہم وطن میر  
 نہ ہم سایہ نہ ہم رشت  
 نہ ہم عصر نہ دوست  
 وہ مرگونی نہ تھا  
 کس تعلق کی بنا پر میں اسے یاد کروں  
 سوگ میں نظم لکھوں بھی تو میں کس طور لکھوں

ساری دنیا دیکھتی ہے  
 اک تماشائی کی صورت  
 ہونے دیتی ہے یہاں جو ہو رہا ہے  
 بربریت اور تشدد، سینہ زوری اور قتل  
 ہز یوں کے کھیت اور باغات میں  
 اینڈ تے، اٹھلاتے بلند درجے کے دل  
 زندہ رہنے سے جڑے  
 کس بل پاک ضرب مسلسل  
 ہر طرف سے  
 نسل کش زخمی میں آئے مرد و زن، طفل و جوان  
 آج بے محفوظ جن کا اور نہ کل  
 پھر بھی اک ایقان، اک جذبہ  
 اپنی اپنا بیت کا سب قسم زیرب  
 روزمرہ کے کسی معمول میں آیا نہ ہو جیسے ظلم

میں تو یہ جانتا ہوں  
 میں نے جو کچھ بھی کہا میری ہی آواز ہے وہ  
 جس کی ہر لہر میں جذبے کی صداقت ہے وہی  
 میری اور اس کی کہن سال رفاقت ہے وہی

وہ کہ زندہ ہے  
 مذاق اے غم دل کیسے اڑاؤں اس کا  
 اور سب لوگ جو کہتے ہیں  
 وہ سچ ہو بھی تو جی چاہتا ہے  
 اس کے مرنے پہ سبکی جشن مناؤں اس کا

تمہارا آدمی تھا وہ

کہ اب جس کے بتوں کو تم گراتے ہو

تم ہی نے تو بنایا تھا اسے

تمہارے سنگ تراشوں نے

تراشے تھے وہ بت سارے

جو تم کہتے ہو وہ جلا دیا تھا

قاتل تھا، خونی تھا

تمہیں کو مطمئن کرنے

گلے گھونٹے تھے اس نے سیکڑوں آزاد بندوں کے

تمہاری ہی تو تمہیں شاہ شایب اس کے مطہم پر

یہ جب تم کو لگا

وہ اب تمہاری بھی نہیں سنتا

تو اب ایک دم سے وہ قاتل بھی ٹھہرا اور جا رہی

پھر تمہیں نے سیکڑوں معصوم انسانوں کو کچلا

بھوک، بیماری، ہتھالی سے مرتے

بے بسوں لاچار انسانوں کو مارا

تم پھر اب یہ چاہتے ہو

اک نہایت اپنے تیشوں سے بنانا

مگر مشکل ہے اب

کہ سارے پتھروں نے خون اتنا پی لیا ہے

کہ جس پتھر پہ تم تیش چلاؤ گے

وہاں سے خون کی ندیاں ہی پھوٹیں گی

تمام دستوں کو پار کرنے والا ہوں  
میں اپنے آپ پہ یلغار کرنے والا ہوں  
ہر ایک درد کو مسہار کرنے والا ہوں  
جہان زرد کو گلزار کرنے والا ہوں  
میں گزری منزلیں پھر پار کرنے والا ہوں  
گذشتہ دور کو سرشار کرنے والا ہوں  
یہ غیر وقت کہیں اور سے گذر جائے  
میں اپنے لہجوں کو دیوار کرنے والا ہوں  
کہ اپنی گرم مزاجی کا ہوں ستایا ہوا  
اب اپنے نام پہ بھی دار کرنے والا ہوں  
کبھی جاہیاں میرے وجود میں رکھ دو  
میں اپنے جرم کا اظہار کرنے والا ہوں  
اب اپنے دوسرے کو کاٹ کر فنا کر دوں  
یہ حادثہ سرہازار کرنے والا ہوں  
حقت لفظ ہیں آنے لگے اٹھتے ہوئے  
میں جیسے پھر کوئی اقرار کرنے والا ہوں  
تم اپنے آپ کو میری حدوں میں آنے دو  
نہفتہ حاشیے بیدار کرنے والا ہوں  
میں تخت تخت ہی ہو کر نکل پڑوں گا ابھی  
تمام راستہ ہموار کرنے والا ہوں



نہ سب کی لوسے چہک نختی تھیں رتیں اپنی  
خوش آید سے روشن رہیں آنکھیں اپنی

غلے دریا میں جہاں قوس قزح بہتی ہے  
چھوڑ آیا ہوں اسی موڑ پہ یادیں اپنی

بات کھل جائے روئی میں تو حیرت کیسی  
شہ یاروں کی نہیں ہوتیں زبانیں اپنی

یاد سننے ہی نہیں دیتی زمانے کی ہوا  
ہم جگر تھامیں کہ دستار سنبھالیں اپنی

یہ بے خبریوں کو اچانک مرے آنسو اندھے  
نہ سب بھی ملتے ہوئے کھوں میں بانہیں اپنی

ہم جمیل اتنے اکیلے تھے قفس جج اٹھا  
جب ڈھکیں حرف دعا میں سبھی سانسیں اپنی

نگاہ شوق ملی تو روز وحشت میں  
زمین رنگ بدلتی ہے دشت غربت میں

لبوں کو چوم کے آہستگی سے چھوڑ دیا  
بہت تو رکھے بھرم وصل کے محبت میں

بہت اداس بہت ہی الگ تھلگ رہتا  
یہ زندگی ہے کہ یوں ہے کوئی عدت میں

وہ آرزو ہی کبھی دل پہ منکشف نہ دئی  
کہیں کار کھائیں جس نے رنج و راحت میں

جمیل آبلہ پائی سے پھول کھل اٹھتے  
جیسے ہوں کسی نہ کسی بات اپنی ہجرت میں

کینیت وصال ابھی تک ہے، انہیان میں  
ہم چند پر تھے اور زمیں آسمان میں

یہ کشتیاں رہیں گی ہواؤں کی منتظر  
جب تک چھپی ہے سمت کسی بادبان میں

میں اس گمان میں رہا کہ حیرتی تو ہے  
رکھی ہوئی تھی کائنات اس نے کمان میں

اب تک نہیں کھلا کہ ہوئی تیز جب ہوا  
تنگی نے گل سے کیا کہا اپنی زبان میں

اندر کسی افق پہ اگا مہر غم جمیل  
اور تیز دھوپ پھیل گئی جسم و جان میں

## عرفان صدیقی، نیر مسعود، شمس الرحمن فاروقی

میں قسمت

عرفان صدیقی: اردو میں سنی شاعر۔ رب کی دعا شاید ہی اس سے زیادہ قبول ہوئی  
میں کہ پیدا

بہت تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جاے  
فلیم عن میر کی قلم روا سے ۔۔۔

یہ میر انیس کی دعا تھی۔ میر انیس کے سلسلے میں ان کی تصنیف کے مختلف  
پہلوں پر بات کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ان کا اسی مرتبہ کا  
میں ۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

میرتی سے نئی فوج کی شکر میں ہمارے

شمس الرحمن فاروقی: دادو، ایوان اللہ۔

عرفان صدیقی: تو اس طرح سے پہلی بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ میری کارنگ و  
آہنگ جو ان سے پہلے تھا اور ان کے بعد بھی جو کچھ رہا، اس سے  
بالکل الگ اور منفرد ایک ان کا انداز ہے۔ میری کے سلسلے میں بات  
کرتے ہوئے تصنیف کے مختلف پہلوؤں میں آتے ہیں، خصوصاً انیس  
کے حوالے سے۔ سب سے پہلے تو عظیات کا معاملہ ہے اور یہ اتنا اہم  
پہلو ہے انیس کی شاعری کی تصنیف کا کہ بات کی ابتدا اسی سے کی  
جائے۔ تو میں یہ چاہتا ہوں کہ عام طور پر جو یہ طے کر لیا گیا ہے کہ  
مثال کے طور پر انیس اور دبیر کے موازنے میں یہ بات کہی گئی اور عموماً  
اس کے بعد بھی یہ بات سمجھی جاتی ہے، کہ انیس کے یہاں فصاحت  
بہت ہے، تو ایک سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ کیا فصاحت نقل بلاغت  
ہے یا فصاحت، بلاغت کی ہی بہترین شکل ہے؟ کیا فصاحت کے

میں قسمت میں ۔۔۔

۔۔۔

یہ انیس کی صد تک نقل و حرکت ہے۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

ہو۔ اب اگر کوئی محل ایسا ہے جہاں آپ کو ٹون پڑتی ۔۔۔

چاہتے تو آپ کی فصاحت کہاں جائے گی؟

شمس الرحمن فاروقی: ہاں۔

نیر مسعود: مثال کے طور پر میر انیس ہی کا ذکر ہے تو ان کی ایک بیت ہے۔

بھانڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا

دور یا لبو کا کشتی گردوں پہ چڑھ گیا

یہ سچ کہیں ہے، "میر" کی "میر" "بڑھ گیا"

عرفان صدیقی: ہاں۔

نیر مسعود: شمس الرحمن فاروقی: ہاں۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔



شخص الرحمن فاروقی۔ ہاں ہاں، بے شک۔

نیر مسعود۔ تو، یا تو ہم فصاحت کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں یا یہ سمجھیں کہ بلاغت کے لیے ہم کو دوسری طرح کی فصاحت مطلوب ہے۔ یا فصاحت فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے، اگر عمل کے مناسب ہے تو وہ فصیح کلام ہے، ورنہ غیر فصیح۔ مثال کے طور پر بعض افسانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسٹے والا ہے اور بڑی فصیح و بلیغ زبان بول رہا ہے، تو یہ تو عرفان صاحب، شبلی، بلکہ شبلی کے پہلے سے ایک محاورہ سا بن گیا تھا کہ میر صاحب کا کلام فصیح ہے اور مرزا صاحب کا بلیغ۔ تفہیم انیس کے جو زیادہ عجیدہ مسائل ہیں ان کی نوعیت تقریباً انھیں شرائط کی ہے جو شرائط غزل کی تفہیم کے ہیں اور جو اکثر ہم لوگوں کی پچھلی گفتگوؤں میں زیر بحث آچکے ہیں کہ غزل کا نظام غزل کی دنیا، ہماری اصل دنیا سے کچھ الگ ہے، یا جیسی بھی ہے اس کو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔

شخص الرحمن فاروقی۔ ہاں، بالکل صحیح ہے۔

نیر مسعود۔ غزل کا محبوب خور ہوتا ہے۔ اس پر بحث نہیں کرنا چاہئے کہ ایک نرم و نازک عورت ہے اور جناب قل کر رہی ہے۔ لیکن آپ اسے مان لیجئے، ورنہ غزل کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح، عاشق شرابی اور رند ہوتا ہے، زاہد ریاض کار ہوتا ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے۔ اسی طرح مرعے میں بھی کچھ مسلمات ہم کو تسلیم کرنا پڑیں گے اور پھر ان کو ہم مسئلہ کے یا تاریخ کے معیاروں پر نہیں پرکھیں گے۔

عرفان صدیقی۔ جی۔

نیر مسعود۔ تو یہ نظام، ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر شعری نظام ہے۔ اس کے ساتھ اس کے کچھ ذیلی نظام ہیں۔ مثلاً اس کا تاریخی نظام ہے کہ عام تاریخ اور خصوصاً تاریخ مذہب، اس کا ہم کو علم ہونا چاہئے۔ وہ تاریخ جو مرعے میں کام آئے گی۔ اعتقادی نظام، وہ بہت ہی اہم ہے کہ شاعر کا کیا عقیدہ ہے، امام حسین، واقعہ کربلا کے ہیرو ہیں، ان کی کیا حیثیت تھی، ان کے کیا اختیارات تھے، کس حد تک وہ معجز نما تھے، وغیرہ۔ پھر بیانیہ نظام ہے، گویا جب ہم مرعے کو بے طور افسانے کے پڑھیں تو اس کا نظام اور ہی قرار پاسے گا۔

شخص الرحمن فاروقی۔ بالکل درست۔

نیر مسعود۔ اس سے ہم کو بحث نہیں کہ کس مہینے میں واقعہ کربلا رونما ہوا تھا، اس وقت وہاں کا نمبر پچ کر کیا تھا۔ ہم کو ان لینا چاہئے کہ آگ برس رہی تھی، وہاں اتنی گرمی تھی۔ یا یہ کہ اس صحرا میں گلاب کا پھول کہاں اور کہاں کہاں؟ مگر یہ بیت آئے گی۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبز ہوا

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تو اس پر ہم کو بحث نہیں کرنا ہے کہ وہاں شبنم تھی بھی کہ نہیں تھی، گھاس

تھی بھی کہ نہیں۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح یہ بات کہی گئی ہے؟ تو اس نظام کو تسلیم کرنے کے بعد ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بات بھلا دی گھوم پھر کر آئی کہ ہمیں مرعے کو خالص شاعری کی حیثیت سے دیکھنا ہوگا۔

عرفان صدیقی۔ درست ہے، اس لیے کہ شاعری کی تفہیم ایک تو مجموعی طور پر شاعری کی حیثیت سے ہوتی ہے۔

نیر مسعود۔ جی ہاں۔

عرفان صدیقی۔... اور پھر مختلف اصناف کے، جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا، اپنے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ان کا نظام بھی ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک بڑی خیال انگیز بات جو ابھی آپ نے فرمائی ہے میں چاہتا ہوں کہ، چونکہ فاروقی صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو ذرا آگے بڑھایا جائے۔ یعنی ہم اتنا کہہ کے شاید انیس کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے کہ فصاحت محض کوئی ایسی چیز تھی جس کا رشتہ بلاغت سے نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میرے اپنے ذہن میں کچھ باتیں ہیں۔ مثال کے طور پر، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ فصاحت کے لیے یہ مان لینا کہ وہ بلاغت سے غیر کوئی چیز ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے نہیں سمجھ میں آتا کہ بلاغت کی ایک معنوی حیثیت ہے اور فصاحت کی ایک ظاہری اور خارجی حیثیت ہے۔ مثلاً یہ کہ الفاظ فصیح بھی ہو سکتے ہیں، غیر فصیح بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن الفاظ بے معنی نہیں ہو سکتے۔

شخص الرحمن فاروقی۔ ہاں، بہت خوب۔

نیر مسعود۔ بالکل صحیح۔

عرفان صدیقی۔ اور جب الفاظ بے معنی نہیں ہو سکتے تو پھر بلیغ ہوں گے۔ تو میں یہ چاہتا تھا کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ معنوی حیثیت سے انیس کی فصاحت ہماری رسائی کتنی دور تک کراتی ہے۔ کیوں نہ فاروقی صاحب کچھ اس اعتبار سے ان کے کلام پر روشنی ڈالیں کہ فصاحت نہ صرف یہ کہ میرے خیال میں نخل بلاغت ہمیں ہے بلکہ اور بلاغت میں اضافہ ہوا ہے جہاں میر انیس نے فصاحت سے کام لیا ہے۔

شخص الرحمن فاروقی۔ اصل میں، عرفان صاحب اور میر نیر مسعود صاحب، آپ دونوں نے بنیادی باتیں سب کہہ دیں اپنے اپنے بیانات میں، کہ تفہیم انیس کے جو مسائل ہیں، وہ کیا ہیں؟ یعنی کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ اکثر و بیشتر میر انیس کی وہ تحسین نہیں کر پاتے اور میر انیس کی شاعری کے بارے میں وہ رائے نہیں قائم کر پاتے جس کی وہ مستحق ہے۔ اس کی وجہیں کیا ہیں وہ آپ دونوں حضرات نے بڑی حد تک، بنیادی باتیں، بیان کر دیں۔ میں انھیں کے حوالے سے کچھ عرض کرتا ہوں۔ مثلاً یہ جو معاملہ ہے فصاحت و بلاغت کا۔ بہت اچھی بات کہی عرفان

— 34 —

*[Faint, illegible handwritten notes]*

مرفان صدیقی۔ درست ہے، اس کا کوئی قائم ہا۔

227/2005/51

[illegible]

$\frac{d}{dt} \left( \frac{1}{\rho} \right) = - \frac{1}{\rho^2} \frac{d\rho}{dt}$

100

100

✎



باہر نہیں ہیں۔ یعنی جو مشرقی سسٹم ادب کا ہے، اس کے ماتحت رکھ کے آپ دیکھیں تو آپ کو پتہ لگے کہ میرے انیس کس طرح کے شاعر ہیں۔ ہومر سے، فردوسی سے بھی آپ ان کو نہیں ملا سکتے، کیونکہ یہ نظمیں جس کو ہم مرثیہ کہتے ہیں، نہ تو یہ رزمیہ ہیں اور نہ فارما ہیں اور نہ کوئی طویل نظم ہے۔ بلکہ یہ مرثیہ ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا چاہئے کہ یہ مرثیہ ہے۔

مردوں سے ملتی۔ یہ اپنے جس یہ مکتبی

شخصِ رُحمٰں کی روٹی۔ حق ماں، ایک اُنک چیز ہے۔ چھ یہ کہ چیز بھی ہے کہ اس کے بعض مخصوص شرائط اور دارم میں، مثلاً اس کا ربانی پسند کہ مرثیہ ربانی پڑھا جاتا تھا۔ مجمع میں سنانے کے لیے یہ چیز تھی۔ ربانی دُعا کہ وہ ربانی لمن پارے کے خواص کچھ اور مروتے ہیں۔ وہ ہم لوگوں سے بڑے نہیں کیے۔ تو ہم لوگوں کو پہلے تو چاہئے کہ یہ انھیں کہ یہ شخص کس نظام کار میں ہے، اس نظام کے تقاضے کیا ہیں؟ اور وقت مضی

”اے اسی سے متحرک رہیں تو ہوں گے کوئی مات بس۔ پہلے تو ہم اس نظام کے تقاضوں کو انھیں۔ مثلاً لوگوں سے کہا کہ صاحبِ مرتبہ سے رابطہ رکھو، اس طرح رہتے آجوتے ہیں، امام مسیحین یا امامانِ معلومہ کوئی صاحبِ حور سے ہیں اور جب میں نے فائدہ لیا۔ اسے بھی اس نظام کا تقاضا ہے کہ مرتبہ میں نہ یہ بدویہ مقامات ہیں تمہارے لوگ راہ میں آجائے کہ وہ توجہ دیں، تواضع دیں کہ شاعر تو دربار کے لیے ایسے ہی لکھتا ہے کہ وہ اس قدر ہے کہ صاحبِ مرتبہ ہیں جو آپ اس پر اتنے ہیں کہ وہ اس سے زیادہ مال حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ ہم پونہ پیٹتے ہیں۔ اس کا پختہ ہیں۔ یہ صوفی ہے۔“

میں سے بدلتی۔ یہ اتنی سادہ یہ سست مہر پہاڑے دریں چہرہ پر تو فیصلے سے  
باتوں میں وہ باتوں کی پہاڑے۔ درنگی شہادت میں شہادت  
یہ کہ جی۔ فی میں جو بات آپ سے فرمائی وہ یہ کہ میں  
میں سے میں میں سب سے سب سے یہ کہ سب سے سب سے  
میں سے میں سے میں سے میں سے میں سے میں سے  
میں سے میں سے میں سے میں سے میں سے میں سے

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
اپنے دل سے کہا کہ میں نے

—

نشست میں غور کریں گے۔ اس وقت ایک بڑی اہم بات یہ ہے  
آئی کہ فصاحت بہ ذات خود کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کا آثار  
کوئی وجود ہو۔ نہالی ثقیل الفاظ کے باوجود کوئی فن پارہ مسج  
ہے اور سبب بھی ہو سکتا۔ روں ترین، سلیس ترین الفاظ کے  
نہیں ہو سکتا۔ اصل چیز یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے تقاضے کیا کہ  
کسی مخصوص چہرہ میں یا کسی مخصوص صنف کے؟

یہ مسعود۔ جلد اب کہی پہنچا ہے کہ ”مصر“ مصری پر ہیں کہ فصاحت و  
جس میں الفاظ رواں ہوں اور آسانی سے زبان سے ادا ہو سکتی  
دغیر وہ اور بلاغت وہ کلام ہے جو مختصائے محل کے مطابق ہو تو ہم  
پر تیار ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ انیس کے یہاں فصاحت نہیں ہے۔  
عرفان صدیقی۔ نہیں ہے۔

خمس الرحمن فاروقی۔ ہاں ہاں، ہم جان لیں گے۔  
عرفان صدیقی۔ اور ایسا ماننے میں انہیں کاکوئی نقصان نہیں ہوتا۔  
ذیہ مسعود۔ جی نہیں، کوئی نقصان نہیں۔

عروں صدیقی۔ بد۔ نہیں کی تمہیں۔ رتے کچھ اور روشن ہو گا میں گے۔  
خمس انہیں وار دتی۔ صحیح ہے۔

عمران مدتی ٹہری۔ یہ شستہ دم ہوتی ہے۔

دومری نشست

[illegible]

... ..

۱۵۔ سلسلے میں تنی جاتی ہے، اور میر انیس نے چونکہ اس میں زیادہ تمنا دکھایا ہے اس لیے میر انیس پر یہ اعتراض زیادہ ہوتا ہے۔

میں اسے اعتراض ہی کہوں گا، کہ صاحب وہ جب مثال کے طور پر میدان کر بلا کا نقشہ دکھاتے ہیں، منظر دکھاتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدان کر بلا کو کوئی صحرا کوئی ریگ زار نہیں تھا بلکہ بہت ہی شاداب اور سرسبز علاقہ تھا۔ اصل میں معاملہ یہ ہے، میرے خیال میں، کہ وہ پہلو ہیں، دونوں اعتراض ایک جگہ جا کر مل جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی خارجی مرقع نگاری کے بارے میں جب یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے میدان کر بلا کو ایک گلستان بنا دیا تو اس کی تہ میں بھی وہی چیز ہے اس اعتراض کی تہ میں ہے کہ انھوں نے حرم امام حسین علیہ السلام کو اس طرح روتے دکھایا جس طرح سے بلا تمثیل ہمارے گاؤں کی عورتیں روتی ہیں۔ ان دونوں اعتراضوں کی تہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جیسا کہ فاروقی صاحب نے فرمایا تھا کچھ ہی بار، کہ اس نظام کو نہیں سمجھ گیا جس کے تحت مرثیہ قائم ہوتا ہے۔

عس الرضن فاروقی۔ درست۔

عرفان صدیقی۔ تو اس سلسلے میں میری ایک عرض ہے۔ مرقع نگاری کے معاملے میں تفہیم کی مشکل میرا نہیں نے شاید ایک حد تک خود حل کر دی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

جب کر بلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا  
دشت بلا نمونہ غلہ بریں ہوا  
مرجھک گما لک کا یہ اوج زمیں ہوا  
خورشید مح حسن حسین حسین ہوا

پالا فردغ نیر دیں کے ظہور سے  
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

عس الرضن فاروقی۔ دادا، بہت خوب۔

عرفان صدیقی۔ تو یہ بات میرا نہیں نے ایک طرح سے خود ہی طے کر دی کہ دشت بلا تو تھائی لیکن وہ نمونہ غلہ بریں بھی ہے۔

نیر مسعود۔ جی ہاں۔ اس کے بعد کابندی آتا ہے۔

عرفان صدیقی۔ جی ہاں۔ پھر وہ کہتے ہیں۔

یہ دشت ہولناک کہاں یہ چمن کہاں  
جنگل کہاں بتول کے گل پیر بن کہاں

عس الرضن فاروقی۔ دادا۔

عرفان صدیقی۔ میرے خیال میں، ایک پہلو سے تفہیم کی ایک بنیادی رکاوٹ انھوں نے خود رفع کر دی ہے کہ دشت بلا دشت بلا ہے، اس کو نمونہ غلہ بریں ہم اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں اس مرثیے کے نظام کے تقاضوں کے تحت اس کو اس جگہ پر نمونہ غلہ بریں تصور کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کا پھر موازنہ Contrast یا مقابلہ ان مصائب سے اور ان مشکلات

سے کیا جانے جو مثال کے طور پر، ایک ریگ زار میں اور ایک ریگ زار میں ہونے والی کارزار میں پیش آتی ہیں۔

نیر مسعود۔ یہ بہت عمدہ نکتہ ہے عرفان صاحب۔

عرفان صدیقی۔ تو ایک تو یہ پہلو میرے ذہن میں آیا ہے، دوسرا وہی باطنی مرقع نگاری جس کو جذبات نگاری ہم کہہ سکتے ہیں۔ اس کے سلسلے میں یہ ہے کہ بہت اچھی اور بنیادی بات یہ طے کر دی فاروقی صاحب نے جس سے پورا اتفاق ہونا چاہئے کہ ایک بنیادی جذبہ ہے، مثال کے طور پر، کسی پجوشن میں رحم کو ابھارنے کا مقصود ہے شاعر کا۔ تو اب اس کے لیے قطعی جائز ہے کہ وہ اس رحم کے جذبے کو ابھارنے کے لیے جتنے Tools چاہے استعمال کرے، اور اس کے Tools پر ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں ان کے استعمال میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس پر اعتراض ہونا چاہئے۔

عس الرضن فاروقی۔ ہاں درست۔ بہت عمدہ بات کہی۔

عرفان صدیقی۔ تو اس سلسلے میں میں چاہتا تھا کہ نیر مسعود صاحب اس بات کو کچھ زیادہ تفصیل سے دیکھیں۔

نیر مسعود۔ عرفان صاحب آپ نے یہ بہت اچھی بات کہہ دی۔ دو بند میں پڑھے دیتا ہوں۔ اب ظاہر ہے بتانے کی ضرورت نہیں کہ امام حسین کی شہادت کے بعد مظاہر فطرت پر کیا اثر ہوا ہے۔

خورشید چمپا گرد اڑی زلزلہ آیا  
اک ابر سیہ دشت پر آشوب چہ چھایا  
بھلی قحی جہاں دھوپ وہاں آگیا سایہ  
بجلی کو سیاہی میں چمکا ہوا پایا

جو حشر کے آثار ہیں سارے نظر آئے  
گرتے ہوئے طفل میں ستارے نظر آئے

عس الرضن فاروقی، عرفان صدیقی۔ دادا۔

نیر مسعود۔ [دوسرا بند پڑھتے ہیں]

برشے سے حیاں تھا غم سہا شہ لولاک  
سر زانوے غم پر تھے جھکائے ہوئے الاک  
دربا کا بھی موجوں سے سرا سر تھا جگر چاک  
اللہ رے ماتم کہ اڑاتی تھی زمیں خاک

آوارہ پرندے تھے مکاں خالی پڑے تھے

چوپائے چراگاہ سے منہ پھیرے کھڑے تھے

تو یہ جیسے واقعیت کا بھی ذکر آ رہا ہے اور مرثیے کے نظام کا بھی، تو میں یہ کہتا ہوں کہ کیا کسی داستان کے ہیرو کی وفات پر یہ سب کہا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں کہا جاسکتا۔

عرفان صدیقی۔ درست۔

پہلے تو یہ کہہ دے کہ یہ سب کچھ ہے

—  $\sum_{i=1}^n \psi_i^2$





زبانی بیانہ خلا ہے، زبانی چاہے میں ہوں ہے کہ پہلے ایک منظر بیان کریں گے، پھر کوئی اور منظر بیان کریں گے۔ ضروری نہیں کہ دونوں میں کوئی براہ راست ربط بھی ہو۔ ایک کے بعد ایک کا سا ہو سکتا ہے۔ ایک کے بعد تین ہے، تین کے بعد چار ہے، چار کے بعد چھ ہے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ مرچے کو اس طرح سے دیکھیں کہ مثلاً Timung اس میں کیسی ہے۔ کس وقت شروع ہو رہا ہے، کب ختم ہو رہا ہے۔ اس کے بیچ میں کون کون سے وقت بیان کیے ہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد کون سا منظر ہے، لیکن اگلا جو ہے وہ دیکھنے کے بعد ہے کہ آدھے گھنٹے کے بعد ہے کہ اس سے فوراً پوسٹ ہے۔ یہ سب زبانی بیانے کے مسائل ہیں۔ کیسے ان کو دیکھا جائے، ان پر گفتگو نہیں ہو رہی ہے۔ یہ چیزیں اس لیے کہ مثلاً اس بات کے کہہ دینے سے کہ صاحب میرا نہیں کا مرثیہ رزمیہ شاعری کی مثال ہے، یا بے انتہا وہ مرچے کے تقاضے پورے کرتا... اس میں چہرہ ہوتا ہے سراپا ہوتا ہے، ظاہر مرثیہ اس کی مثال ہے۔ اس سے کام نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ آپ مثلاً ہی آپ پوچھ لیجئے کہ کسی ایک مرچے میں کتنے بند ہیں، ان میں سے کتنے بند بین کے ہیں، اور کتنے بند گھوڑے کی قریب میں ہیں اور کتنے بند اس میں کواری کی قریب میں ہیں؟ ان میں کیا رہا ہے، کس کس وقت کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ کون سا مرثیہ صبح سے شروع ہو رہا ہے، کون صبح کے بعد شروع ہو رہا ہے، کون شام کو شروع ہو رہا ہے۔ یہ سب چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ یہ جو اس کی صفات ہیں، کس کس طرح سے مرثیہ ہمارے سامنے unfold ہوا ہے، یہ دیکھیں ہم۔

فان صدیقی۔ اصل میں یہی کی رہتی ہے مطالعہ میں جو تفہیم کے بہت سے مصائب، مصیبتوں کا بلکہ میں کہوں گا مصائب کا نہیں بلکہ مصیبتوں کا باعث بن جاتی ہے۔

سعود اور حسن الرحمن فاروقی۔ جی ہاں، ہاں۔

عرفان صدیقی۔ اور جو زبانی پہلو ہے مرچے کا، جب تک اس کو ذہن میں نہ رکھا جائے، میرے خیال میں مرچے کی تفہیم کا بنیادی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

نیر مسعود۔ بہت سے الفاظ انہیں صرف اس لیے استعمال کریں گے کہ مرثیہ زبانی بناتا ہے۔

عرفان صدیقی۔ جی ہاں۔

نیر مسعود۔ مرثیہ اگر خالی تحریری صنف ہوتا تو ممکن ہے وہ کوئی اور لفظ استعمال کرتے۔

حسن الرحمن فاروقی۔ بالکل صحیح ہے۔

نیر مسعود۔ مثال ایک، فاروقی صاحب، اس کی ہوں ہے۔ ظاہر ہے کہ لہجے کی تو بہت سی مثالیں ہیں ہی۔ جب امام حسین (کربلا میں) آپٹے ہیں اور ان کے ایک دو دن بعد ابن سعد کا لشکر آتا ہے۔ تو وہ پوچھتا ہے کہ کیا صورت حال ہے، لوگ بتاتے ہیں، تو ابن سعد کہتا ہے کہ ان سے بیعت کو کہو اب۔۔۔

بولا کوئی کہ ہے انہیں بیعت سے اجتناب

کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے بیچ و تاب

ہاں اب خیام شاہ میں جانے نہ پائے آپ

یہ مصرع میں نے غلط پڑھا (ہنسی)۔ اصل میں ہوں پڑھنا چاہیے:

"کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے بیچ و تاب"۔ اس کے بعد وہ "ہاں"

کہے گا حیرت سے: "ہاں؟"، یعنی "اچھا؟"

عرفان صدیقی۔ "ہاں؟"

نیر مسعود۔ جی۔ اب باقی مصرع پڑھئے: "اب خیام شاہ میں جانے نہ پائے آپ"

عرفان صدیقی۔ ہاں، درست ہے۔ تو یہ ہے گویا زبانی بیان کی قوت جس کی طرف فاروقی صاحب نے اشارہ کیا، اس کے بغیر مصرع نہیں سمجھ میں آ سکتا۔ شکریہ ☆☆☆

"منظر پس منظر" اور "سنہری اداسیاں" کے بعد

شاہد ماحلی کا نیا مجموعہ کلام کہیں کچھ نہیں ہوتا شائع ہو گیا

دلکش گٹ اپ بہترین طباعت قیمت : ایک سو روپے

ملنے کا پتہ : معیار پبلی کیشنز، کے۔ ۲۰۳، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔ ۱۱۰۰۳۱

email : shahid\_meyar@hotmail.com

(نذر مقبول فدا حسین)

وہاں وہاں کی ٹہپہ و ستاں ہے  
 زمین و زمان سے یہ ہے جہی جہاں سے  
 جہاں سے آئے جہاں مل رہے ہیں  
 وہاں زندگی کے نشاں مل رہے ہیں  
 جہاں حور و خلک ہیں باغ عدن ہے  
 وہاں اک بدن ہوا ہے بدن ہے  
 بدن آسمان سے بدن ہی زمین ہے  
 بدن تو میں ہے تو چہ تو ہی نہیں ہے  
 بدن زندگی ہے بدن مر خوشی ہے  
 بدن رقی سے بدن بندگی ہے  
 بدن پانچ سو رنگ بدن کشتی ہے  
 بدن یہ جہاں ہے بدن دو جہاں ہے  
 بدن ہے سمندر بدن ہے کراں ہے  
 بدن بجلیوں کی چمک میں نہاں ہے  
 بدن رنگ و بو ہے چمن و چمن ہے  
 ایورا اجنا کے فن میں بدن ہے  
 بدن موسموں کا تیا باطن ہے  
 بدن میکدہ ہے بدن ہی نشہ ہے  
 بدن کی مہک سے معطر فضا ہے  
 بدن ابتدا ہے بدن انتہا ہے  
 بدن ارتقا ہے بدن میں خدا ہے  
 بدن جو نہیں ہے خلا ہی خلا ہے  
 صدا ہے صدا ہے فنا ہی فنا ہے

اک نئی منزل کی جانب تھا سفر کا سلسلہ  
رفتگاں اب اس جہاں میں لوٹ کر آویں گے کیا



خُن مجھ سے ہمدان مجھ سے، گمں مجھ سے، یقین مجھ سے  
زمین خواب پر اترے نہیں اب تک میں مجھ سے  
کنار چوں سے میں اب بھی مڈرتا ہوں، مگر کم کم  
سو دریا پہلے جیسی گفتگو کرتا نہیں مجھ سے  
یہی اک دور آنکھوں میں رہے گا شام آخر تک  
بہت مانوس ہو جیسے یہ خواب اولیں مجھ سے  
غبارِ راہ سے غافل ہوں میں اور بھول بیٹھا ہوں  
حساب ہر ہی بھی مانگ سکتی ہے زمیں مجھ سے  
خدا جانے ہوا کا مسئلہ کیا تھا سرِ صحرا  
ہوا کے کام آئے ہیں کئی صحرا نشیں مجھ سے  
ہدن بعد ہدن ایسا سفر بعد سفر جیسا  
مری آواز پا کو اب کوئی نسبت نہیں مجھ سے  
مرے اندر جو خاک اڑتی ہے دہرے زیادہ ہے  
سودا آگے نہ بڑھ جائے اسی دھن میں کہیں مجھ سے

دل ملیں بھی تو یہی ملنے کی حالت رہے گی  
ایک خلوت میں نخل دوسری خلوت رہے گی  
اگر اہل پار سے آوازیں مرے ساتھ نہ آئیں  
مجھے اس پار اترنے میں سہولت رہے گی  
شجر چوں سے بس اک پار اڑانے کی ہے دیر  
ان پرندوں کو کہاں میری ضرورت رہے گی  
اک مسلسل میں دو تار ہوں گا دن رات  
روشنی مجھ سے عبارت ہے، عبارت رہے گی  
جب تک آتا نہیں خاموش سفر سے واپس  
میری آواز ترے پاس امانت رہے گی  
کیسی خاموشی سے آواز دروں ٹوٹ گئی  
میں سمجھتا تھا یہ زنجیر سلامت رہے گی  
مجھے آئے کہ مری حد نظر کو چالے  
ایک شخص ایسا ہے جس کو یہ رعایت رہے گی

یہ طرز خود آرائی ہے لافانی ہماری  
آئینے کی حیرانی ہے حیرانی ہماری

اس دشت میں درکار تھا اسباب سفر اور  
بے کار گئی بے سرو سامانی ہماری

خوشبو کے سوا کوئی ہمیں جانتا کب تھا  
ک پھول کو سوئی گئی نگرانی ہماری

کشتی میں تھے اور مشورے دیتے رہے کیا کیا  
دریا نے مگر ایک نہیں مانی ہماری

یہ شام ہمیں دیکھتی ہے اپنا سمجھ کر  
اس خواب پہ واجب ہے نگہبانی ہماری

یہ ہونے نہ ہونے کی سزا مل گئی آخر  
یوں ہانٹ لی مٹی نے پریشانی ہماری

کسی آئینے پہ میں مگر نظر نہیں کر سکا  
ترے بعد کوئی بھی عشق اثر نہیں کر سکا  
اسے خاک پر سے گذرنا کتنا محال ہے  
ترے خواب پر جو گذر بسر نہیں کر سکا  
میں پٹ کے آیا تو باغ خالی ملا مجھے  
مرا انتظار کوئی شجر نہیں کر سکا  
شب بھر جیسی رواں تھی ویسی رواں رہی  
میں کوئی بھی لہر ادھر ادھر نہیں کر سکا  
کوئی تم سے دور بھی تھا تمہارے حضور بھی  
مگر اس طرح کہ تمہیں خبر نہیں کر سکا  
مجھے موج میں بھی مقیم ہونا ہے ایک دن  
کئی کام ہیں میں جو موج پر نہیں کر سکا  
عجب انتشار سخن میں تھا ترے روبرو  
سو میں اپنی بات کو مختصر نہیں کر سکا  
مجھے سوتے جاگتے ایک جیسا ملال ہے  
مرا خواب کیوں مجھے معتبر نہیں کر سکا

## غزلیں

### شفق سوپوری

گھر کیا، سایہ دیوار و در ہے صحرا  
 جتوں کا تو ہر حال میں گھر ہے صحرا  
 میں اس کو زخموں میں ڈبو کر لگتا ہوں  
 مجھ کو غم کے پرندے کا پر ہے صحرا  
 گرم خیال بگولے بن کر اٹھتے ہیں  
 میرے لئے گویا میرا سر ہے صحرا  
 میں نے اکھاڑیں کل نیلوں کی سب قبریں  
 دیکھو آج کی رات برابر ہے صحرا  
 صحرا میں کیا وحشی غزالاں ہوتے ہیں  
 شہر سے تو حد درجہ بہتر ہے صحرا  
 دور تلک ہیں دھند کے غیموں کے مہتاب  
 ویرانی میں کیا خوش منظر ہے صحرا  
 خاک سے ایک مکان شفق نے بنوایا  
 صحن میں جس کے جنگل، چھت پر ہے صحرا

طہت خاک ہی دل کے میروں کی ہے، ہو  
 سانسوں میں زنجیر میروں کی ہے، ہو

نغمے کی ہو نوبت یا نوحے کی جھنکار  
 ایک صدا بس تیرے فیروں کی ہے، ہو

مال نفس جب تک ہے محفوظ قضا سے  
 لو، خیرات فنا کے ہیروں کی ہے، ہو

میں زخموں میں انگلی ڈبو کر لگتا ہوں  
 کیسی کرنامت ترے تیروں کی ہے، ہو

تیرے نام سے ہی پر معنی ہے درد نہ  
 دل کہ عبارت چند لکیروں کی ہے، ہو

دل سے باہر جتنی بھی دنیا ہے شفق  
 شاہوں کی ہے اور وزیروں کی ہے، ہو



ہر اسندہ

دل کے اندر

باہر تو دیرانی

بول مری مچھلی کتنا پانی

اور کتنی گہرائی

میں تو اپنے اندر جھانک کے

رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی

دریا میں

کیسے توڑ نبھائی

تو نے نیچوں (۲) سے اشنائی (۳)

میں تو اپنے اندر جھانک کے

رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی

پانی میں

تو نے کتنی کالک دیکھی

اور کتنی رشنائی (۱)

میں تو اپنے اندر جھانک کے

رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی

ریلے میں

ست رنگے جھڑیلے میں

کیسے مشک چھپائی تو

میں تو اپنے اندر جھانک کے

رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی

سادن میں

تو نے پیاسے پانی کی

کیسے پیاس بجھائی

میں تو اپنے اندر جھانک کے

رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی

ریگ سندھ

رقص قلندر

کیسے بھر چھاتی سے

پھوٹ پڑی سچائی

میں تو اپنے اندر جھانک کے

رات بہت شرمائی

کون جانے شام کو گزرے گی کیا باز پر  
روقیں نازل نہ ہوں گی بھیڑ کے صرار پر  
فعلہ سفاک بجز کا تھا بجز کہتے ہی بجھا  
اک چراغاں سا ہوا تھا سانس کی دیوار پر  
ایڑیوں سے دشت کو دریا بنا کر چل دیا  
ہمید ریگستاں نے کھولے لشکر جبار پر  
شور کا سیلاب تھا سب کچھ بہا کے لے گیا  
ہو گئی قرباں معطر خامشی گفتار پر  
فقر کی دولت سے مالا مال ہیں اللہ ہو  
ہم نظر رکھتے نہیں دنیا درم دینار پر  
برسر پیکار سایوں سے تھے اندر سب کیس  
اور باہر دھوپ پھیلی تھی در و دیوار پر  
راز کرتا ہے زبان خامشی سے تو عیاں  
صوفیوں کا رنگ چھایا ہے ترے اظہار پر

ڈر ہے کنگ نہ جائے مرے ہی مکاں میں آگ  
بجز کی ہوئی ہے آج تو خوب آسماں میں آگ

خاہر ارادہ اونچی اڑانوں کا کر دیا  
طائر نے خود لگائی خس آشیاں میں آگ

ہر سمت ہارٹوں میں کھلے سرخ رو گلاب  
برسات ہے لگی ہے ترے گلستاں میں آگ

جھرنے خموشیوں کے تھے دونوں طرف رواں  
اور رقص کر رہی تھی کہیں درمیاں میں آگ

درد زباں درود برائیم ہے تو پھر  
ٹھنڈی رہے گی میرے لئے ہر زمیں میں آگ

ایک صحرا ہے مری آنکھ میں حیرانی کا  
میرے اندر تو مگر شور ہے طغیانی کا

کوئی دردیش خدا مست ابھی شہر میں ہے  
نقش باقی ہے ابھی دشت کی ویرانی کا

سانس روکے ہے کھڑی در سے ترے دور ہوا  
خاک دل یہ ہے سبب تیری پریشانی کا

ہم فقیروں کا توکل ہی تو سرمایہ ہے  
شکوہ کس منہ سے کریں بے سروسامانی کا

دل کے بازار میں ہلچل سی مچادی اس نے  
مجھ کو بھی دھوکا ہوا یوسف لاثانی کا

دیکھتا ہوں میں ابھی خواب اسی کے شب و روز  
یہ خلاصہ ہے مرے قصہ طوفانی کا

## محمد عاصم بٹ

دروازوں کے تھڑے پر بیٹھ کر اچھو کی راہ نکلتا۔ انتظار سے اسے ہمیشہ کولت ہوتی لیکن روزانہ یہ کولت اٹھائے بغیر نہ جاتی۔

دیر بعد پانی کے چھیتوں سے بھیکے چہرے کے ساتھ اچھو نیم خوابیدہ لم بیدار سا آتا۔ "تو آپ ہی کیوں نہیں اٹھ جاتا اب صاب۔" وہ غصا ہوتے ہوئے کہتا۔ اچھو احنائی سے ہنستا۔

"میں نہیں حیرانگہ کرنا، روز شاہی مسجد کے باہر بارہوری میں جب تو نماز پڑھنے جاتا ہے؟"

"تو کون کہتا ہے تجھے انتظار کرنے کو۔ میرے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھتا؟" روزانہ اسے نماز کی تلقین کرتا۔ لیکن وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا۔

"نماز پڑھنے کے لیے بندے کو پاک صاف ہونا پڑتا ہے، پاگل۔" غرور سے کہتا۔ "تو نہا تا کیوں نہیں تو؟"

"تو بھی جھٹا ہے سولہی۔ نہاتے ہوئے زیادہ خطرہ ہوتا ہے ٹپا پل ہونے کا۔ اب یہ مت کہنا کہ ہاتھ پیچھے ہاندھ کر نہ پا کر۔" غرور بھول کر سر جھٹکتا اور گل پڑتا۔

روزانہ منٹو پارک جا کر وہ میپ پر ٹیکس کرتے۔ اچھو ہار تھا اور غرور بے باز دونوں اچھے کھلاڑی تھے بھی تو اختیارات میں لیل یا اکثر رعایتی ٹیروں سے پاس ہونے کے باوجود اسکول والے انہیں ہر سال اگلے درجے میں ترقی دے دیتے اور یوں وہ دسویں جماعت میں آ گئے تھے۔

غرور نے ایک جگہ رک کر سیکل کے ٹکے سے منٹو لگا کر پانی پیا اور چند پھینٹے چہرے پر مار کر گیلے ہاتھ داڑھی اور اپنی فوجی نوپا سے باہر کندھے پر جھولتی زلفوں پر پھیرے۔

چوک جھنڈے خان سے گزرتے ہوئے اسے اچھو کے ٹولے کا ایک لڑکا ہوا آنے کی جگہ کے باہر لکڑی کے بڑے تختے پر اکیلا بیٹھا تھا جہاں سال ایک پہلے تک جب اچھو کرتا نہیں ہوا تھا کیسی منڈی جیسی تھی جس کا دلہا اچھو ہوتا۔

"بس بھورا سا نشانہ چوک گیا سولہی صاب نہیں تو کو بے کا دھرا بیٹا بھی ہلڑک جاتا۔ اس نے تو استاد کو دیکھتے ہی دھڑکی لگا دی تھی۔ میں نے سولہی

ابھی پوچھیں یہی تھی۔ آسمان میں ستارے جگر جگر چمک رہے تھے۔ اندرون شہر کوچہ چھاپ گراں کی ایک گلی میں چند رولہ برس کے لوجوان غرور نے مشعلیوں سے منہ کے آگے بھونپو مٹایا اور بلند آواز میں پکارا "اچھو لوئے"۔ رات کے سٹالے میں اس کی آواز میں گونجی جیسے خالی برتن میں سکے کھٹکنا ہوا۔

بانی کا یہ منظر غرور کو ہمیشہ یاد رہا اور یہ آواز اب بھی اس کی یادداشت کے گنبدوں میں گونجتی ہے۔ لیکن اب اسے لگتا وہ اچھو کو نہیں مٹا پھار سے پکار رہا تھا۔

اس نے ہاتھ پھیر کر لیس کے نیچے پیٹ سے بندھے ہوئے لٹیر اور اس میں لگے پستول کو چھو کر اطمینان کر لیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا اور جلد سے جلد سڑ سڑی چوک پہنچنا چاہتا تھا جہاں اسے علم تھا کہ کو بے بد معاش کا چھوٹا بیٹا روزانہ شام کو اپنے ابا سے پر جب قمار بازوں کا خوب رش ہوتا ہے چند گھنٹے ضرور بیٹھتا ہے۔

پچھلا ایک سال اس نے سرحد پار جہاد کی ہنگامہ خیزیوں اور سخت ترین حالات میں گزارا تھا۔ کتنے ہی کافر اس کے ہاتھوں کیلر کردار کو پہنچے اسے تو ان کی گنتی بھی یاد نہیں تھی۔ لیکن ان سب کے چہرے اسے صاف یاد تھے جن کی چھاتیوں میں اس نے اپنی بندوق سے گولیاں اتاری تھیں۔ کیسی تسکیں محسوس ہوتی ہے انسان کو جب وہ کسی ایسے شخص کو مارے جس سے انتقام لینے کا اس نے برسوں خواب دیکھا ہو۔ وہ اپنا خواب شرمندہ تعبیر کر کے لوٹا تھا۔

لیکن اس تجربے کے نتیجے میں گولیوں کی ترزا ہٹ اور بسوں کے پھٹنے کے دھماکے جیسے مستقل طور پر اس کے کالوں کی اندرونی پر توں میں سما گئے تھے۔ اور خاص طور پر ان لمحوں میں خوب زور سے اس کے دماغ میں گونجنے لگتے جب کسی باعث رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ اس وقت بھی اس کا دماغ اس شور سے جھنجھٹا رہا تھا۔

اسے یاد تھا روزانہ آواز دینے کے بعد وہ سامنے گھر کی دیوار سے ٹک لایا اور کرکٹ کی گیند ہاتھوں میں جھٹاتا۔ کبھی دائیں ہاتھ سے بائیں میں، اور کبھی بائیں سے دائیں میں۔ حتیٰ کہ اچھو کی ماں محبت سے نماز پڑھنے اترتی تو دھوکہ کرنے سے پہلے جگے سے جھانکتی۔ اسے دیکھ کر وہ خاموشی سے مڑتا اور چپٹا ہوا گلی کی کھڑ پر



وینا۔ بس نکر کر اسے نکلتا۔

لیکن پھر اس عمر میں جب ماں کسی کے سمجھائے بغیر خود بخود کچی پکی سی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور غمخیزی اور گالوں پر بالوں کی اولین فصل نمودار ہوتی اور زخروں میں ایک کلتی سی آگے کو نکل کر آواز میں مردانہ کھردراہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ اسے ماں کی باتوں میں موجود نفرت کی حدت محسوس ہونے لگی۔ یہ حدت اس کے خون میں ابال پیدا کرتی اور خون لپکتا ہوا اور پر داغ کو چڑھتا۔ وہ سوتر منڈی چوک میں کھڑے ہو کر بڑے حلقے کی وجہ سے بے انتہا حیرت ہو کر چوک پر بیٹھا گوشت کا تودا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اڑے کے آگے سے گزرتا تو ٹھٹھک جاتا۔ نفرت ایک ایسی چنگاری کی صورت میں اس کی آنکھوں میں بھڑکتی جیسے غصے کی ہوا پھپھکتی ہے تو وہ پورا جنگل جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔

میزک کے ابھی امتحان نہیں ہوئے تھے جب دونوں کا انتخاب انڈر سکشنین مٹی ایون (Under Sixteen City Eleven) میں ہو گیا۔ اس طرح سے انھیں صوبائی سطح کے میچوں میں کھینے کا موقع ملا۔ لیکن میزک کے بعد ان کی دلچسپیوں کے دائرے کچھ یوں بدلے کہ زندگیوں کا نقشہ ہی بدل گیا۔

نذیر الشکر دین کے مجاہدوں کے جذبہ ایمانی سے اتنا متاثر ہوا کہ خود بھی تنظیم کارکن بن گیا۔ جہاد سے لڑنے والے مجاہدوں کی روداد اس میں جوش و دلولہ پیدا کرتی۔ کیسے انھوں نے کافروں کے سینوں میں فخر گھونپنے، ان کی چڑکیوں اور گازیوں کو بھوں سے اڑایا اور انھیں گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہ کہانیاں اس کے سینے میں سانس کی گردش خیز کرتیں اور نفرت کی آگ کو ہوا دیتیں۔

”مسلمان بھائیوں پر ظلم کا انتقام لینا آپ کا فرض ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اعنف کا جواب پتھر سے دیں۔ یہ باتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔ انھیں بھی دیسے ہی تڑپا تڑپا کر، ماریں جیسے انھوں نے، مارے بھائیوں اور بہنوں، بیٹیوں کو مارا۔ اور یہ انتقام تو جوان ہی لے سکتے ہیں۔“ اسے تنظیم کے اجتماعات میں بتایا جاتا۔ وہ زیادہ وقت انھی مجاہدوں کے ساتھ گزارتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نیت پر یکمشت چھوٹ گئی اور جب ایف۔ اے۔ کے واسطے کھیلے تو کالج میں فارم جمع کرانے کے بجائے وہ ظفر آباد میں ”الشکر دین“ کے ساتھ ہی اجتماع میں شرکت کے لیے چلا گیا۔ اچھو تعلیم اور کھیل کے میدانوں میں نذیر ہی کی وجہ سے تھا۔ اس نے قطع تعلق کر لیا تو وہ بھی ان سے دست کش ہو گیا۔

ساتھ اجتماع کے موقع پر ”الشکر دین“ کے سربراہ مولانا شوکت علی خان کا ایماں افروز اور پر جوش خطبہ نذیر کو یاد تھا۔ مولانا نے کہا تھا:

”نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ تن من و دھن کی بازی لگانے اور اپنی جائیں قربان کر کے شہادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی ہمارا دینی فریضہ بھی۔“

اس بات نے اس کے ذہن پر وہی قفل کیا جو رنگ کاٹ کپڑے پر کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک قطعی یارنگ اس پر چڑھا۔ کافروں کے خلاف نفرت کی ایسی جواں کھمی اس کے اندر جڑی کہ اس نے اپنا نام مجاہد بننے کے خواہش مندوں کی

صاحب بڑا سمجھایا استاد کو کہ علاقہ غیر چلا جائے۔ پر اس کی ایک ضد تھی کہ چھوٹے کو مار لوں تو پھر جاؤں گا۔ وہ سر سے گا تو میرا انتقام پورا ہوگا۔ میری ماں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے گی۔ جب تک استاد پکڑا نہیں گیا وہ بھی غائب رہا۔ اب بڑا کڑ کر پھرتا ہے۔ اسی نے استاد کو پکڑ دیا تھا۔ پولیس تو ان کی پالتو ہے، کسے نہیں پتہ یہاں۔“

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا دل بو جھل ہو رہا تھا۔ ”اب تو وہ بھی ہمیں آ کر تڑپاں لگاتے ہیں جو استاد کے ہوتے ہوئے کھینکے نہیں تھے۔ استاد جیسا جوان پھر نہیں جتنا کسی ماں نے یہاں۔“ اس کا گلہ بندھ گیا۔

اچھو کا باپ رکشا ڈرائیور تھا۔ شریف مگر جتنے کا مضبوط اور مزاج کا غصیل۔ بس کسی بات پر اس کی کوبے سے، جو سوتر منڈی میں جوئے اور نشے کے اڑے چلاتا تھا اور جس کا پولیس اور ہائی حوری میں بڑا اثر و رسوخ تھا، اڑھس ہو گئی۔ غصے میں اس نے کوبے کے کارندے کو پھینکی بھی لگائی جس کا بدلہ کوبے نے اس کی جان سے کر لیا۔ ایک رات جب وہ رکشا کو اسٹینڈ پر کھڑا کر کے گھر لوٹ رہا تھا اس نے اپنے کچھ بندوں کے ساتھ اسے مسجد مائی لادو کے پھجواڑے میں روکا اور دھرتا ہوا اپنے علاقے میں سے آیا پھر پھر سے اسے اس کا بیٹ چیر ڈالا۔ قتل سر عام ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ پولیس کو کوئی گواہی ایسی نہیں ملی جو مقتول کے لواحقین کی طرف کوبے پر گائے گئے قتل کے الزام کو ثابت کرتی۔ عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا۔

ایک مدت تک اس واقعے کی دہشت علاقے میں سڑے ہوئے گوشت کی بو کی طرح پھیلی رہی۔ لیکن پھر جیسا کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے لوگ رفتہ رفتہ اسے بھوں گئے۔ واقعہ عوامی یادداشت میں ضرور باقی رہا لیکن ایک ایسے دور وراز خطرے کی مانند جس کی زد سے وہ سب باہر بچے، ایسا سانپ جس کے دانت سے زہر نکال لیا گیا ہو۔ لیکن اچھو کی ماں کی یادداشت میں یہ سانپ بس سے بھر اور ہمیشہ بچن پھیلانے پھنکارتا رہا۔ اس زہر کو، جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کا ہر ہٹ بھر کیا، اس نے دھیرے دھیرے اپنے بننے میں منتقل کیا۔ جیسے کبھی دس کنیا تیں تیار کی جاتی تھیں کہ جن کی سانسوں میں بھی رہا ہوا آتا تھا۔ ایسا ہی وہ اپنے بیٹے کو بنانا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتاتی ”سوتر منڈی میں ہے تیرے باپ کا قاتل۔“

کیسا دھناتا پھرتا ہے، کسی ساغ کی طرح اس نے اسے قتل کرتے دیکھا پر کوئی اس کے خلاف نہیں ہوا۔ خدا نے اس کی رسی ڈھیلی کی ہوئی ہے۔ ہر ایک دن میرا بھی آئے گا۔ کوئی مائی کا ال اٹھے گا، اس سے بدلہ لے گا۔ ایک ایک ظلم کا، خون کی ایک ایک بانہ کا جو تیرے باپ کے جسم سے نکلی۔ تب میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے گی۔“

اس کی ماں غصے میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پاتی اور چھاتی پر دو ہنتر مارتی۔ اور پھر جب خاوند کی کئی پھنی اٹش اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تو اٹھائیں مار کر روٹی اور دیر تک اپنے آپ میں نہ راتق۔ وہ اس کی باتوں کو ہلکے کچھ سمجھتے اور کچھ سمجھنے کے انداز میں سنتا۔ یہ باتیں اسے دلچسپ معلوم ہوتیں جیسے کسی فلم کے ڈیڈک ہوتے ہیں۔

”تو یہاں پتا ہے۔“ اسے مظلوم باپ کی موت کا ”اچھو کوئی جواب نہ

اجتماع ہفتہ بھر جاری رہا۔ پھر وہ عسکری تربیت کے کیمپ میں شامل کیا۔ کوئی تین ایک ماہ بعد گھر لوٹا تو اس کی کایا کلب ہو چکی تھی۔ اس نے وازمی مالی تھی، سر پر بندھے سفید صافے میں سے بالوں کی ٹیس گردن پر بھول رہی تھی۔ لیکن اسے وہ حیرت اور بے بسی کبھی نہیں بھولی جو اپنی زندگی جہاد کے لیے کرنے کا فیصلہ سنانے پر اس نے اپنے باپ کے چہرے پر دیکھی تھی۔ وہ جیسے پ کا چپ رہ گیا۔ نہ اتنا حوصلہ تھا کہ اپنے ایک ہی ایک بنے کو جہاد اور شہادت کے راستے پر چلنے کی اجازت دے جس سے زندہ واپسی کا امکان کم تھا اور نہ اسے کتنے کا کوئی جواز تھا کہ یہی تربیت اسے دینا چاہتا تھا۔ ماں نے سنا تو سر پیٹ لیا۔

”مسلمانوں کے گلے کاٹنے جا رہے ہیں۔ مسلمان ماؤں، بہنوں، بچوں کی عزت تار تار کی جاتی ہے۔ کیا ہمیں بے غیرتوں کی طرح تماشا دیکھنا ہے؟ چوریاں ہمیں کر بیٹھے ہیں“ اس نے اچھو کے سمجھانے پر طیش میں آتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ دقت باتوں کا نہیں۔ بندوق اٹھانے کا ہے۔ ہمیں طاقت کا اب طاقت سے دینا ہوگا۔ مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کی خبریں پڑھ کر میرا خون گولتا ہے اور بدلے کی آگ جلاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے ان کے حائے امارتوں۔ تبھی میرے اندر کی آگ بجھے گی۔ میں اب تک گمراہی کی زندگی گزار رہا تھا۔ سو انا شوکت علی خان نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کچھ ٹریننگ تھی ہے۔ میں نے اپنی وصیت بھی بیٹہ کو ارز میں جمع کر دادی ہے۔ خدا سے عہد کر رہا ہے۔ یہی میرا جینا مرنا ہے۔“

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نذر چھ ماہ کی آخری ٹریننگ کے لیے وال آباد چلا گیا جہاں سے اس کی سرحد پار جہاد کے لیے لائینگ ہوئی تھی۔ لیکن یہ انقلاب نذر کی زندگی میں ہی نہیں آیا، اچھو بھی اس کی زد سے بچ سکا۔ کچھ عرصہ تو وہ اپنے چچی کاں پر بیٹھ کر ٹریننگ کا کام سیکھے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ کام اس قتلون مزاج کے موافق نہیں تھا۔ حد ہی اس نے بیزار ہو کر ان پر جہاں ترک کر دیا۔ اب وہ سارا دن چڑی، ماراں گلی میں اپنے ایک دوست کے ویڈیو سنٹر پر بیٹھ کر گزارتا۔ ماں دایہ گیری کا کام لیتی تھی۔ چچی بھی وہ بہادر خبر گیری کرتا۔ مگر کا خرچ اس کے باوجود کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا انہیک چل پاتا تھا۔ انا ماں اسے جیب خرچ دیتی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پر غم آواز سن سکتی: ”خدا نے تیری صورت میں مجھے ایک مضبوط بازو دیا ہے تاکہ میں تیرے پ کے قاتلوں سے بدلہ لے سکوں۔“

ویڈیو سنٹر کے۔۔۔ ابر کیرم بورڈ سنٹر میں ہر گیم پر پیسے لگتے تھے۔ ایک بار جیتے اور ہارنے والی پارٹیوں میں دھیک کا مشتق ہوئی تو اس نے جاکر چچا کو کرایا اور گا مار کر زیادتی کرنے والی پارٹی کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ پھر تو وہ وہیں کر بیٹھے لگا۔ طبیعت کا اتھرا تو تھا ہی، اس پر فراغت نے جسم میں پھیلاؤ پیدا کیا تو اس کے کز کے میں دم خیم پیدا ہوا اور وہ علاقے کا چھوٹا سا ڈانڈا بن گیا۔ کیرم بورڈ پر جیتنے والی پارٹی ہر گیم پر اس کی جیب میں بھی ڈال دیتی، اس اعتماد پر اس

سے امن دمان قائم رہے گا۔ یہ کنوٹی سی کوئیں بری تھی۔ یوں ہی آہنی ہاتھ زریعہ بن گیا۔ یہ کام آسان بھی تھا اور اس کے مزاج نے میں مطابق تھی۔ یہ اب بد معاشی کا کام تھا کہ جس میں بد معاشی کرتی نہیں پڑتی، بس ایسا ہی روکھنا پڑتا تھا۔ اور اگر بد معاشی کرتی بھی پڑے تو اس میں بھی کوئی مضامین نہیں لکھتا۔ چار پیسے چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد اس کا جھکا کھل گیا تھا اور ہاتھ بات بات پر دوسرے کے گریبان پر لپکتا۔ سو یوں ہوا کہ آستہ آستہ اس کا اٹھنا بیٹھنا، مات، اور اس سب ایک خاص رنگ میں ڈھل گیا۔ کیرم بورڈ سنٹر پر اس نے اپنا ایک کانا بھینچا۔ وہ خود زیادہ دقت چوک محض ہے میں، جس سے آگے کوئے کا علاقہ شروع ہوتا تھا، آگے کی چکی کے باج ٹکڑی کے بڑے تختے پر بیٹھا دکھائی دیتا۔ علاقے ہک چھوٹے موٹے گھسٹے اسے خیرے رہتے۔

میر کو گوریڈ ٹریننگ پر گئے چند ماہ ہوئے تھے سب یہ واقعہ دیکھ رہے تھے۔ رور سوتر منڈی چوک میں کوئے قصائی کے بیٹے سے اچھو تو تو میں میں مولی۔ یوں تو دونوں پارٹیاں کسی نہ کسی بات پر سینک پھنسی لیتی تھیں لیکن لوگ درمیان میں آکر سچ بچاؤ کر دیتے۔ اس بار بات بڑھ گئی۔ دونوں طرف سے روج والوں نے چوٹ لکل آئے تو علاقے میں بھگدڑ مچ گئی۔ خوب فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں اچھو کا ایک زکار غمی ہوا۔ وہ سب بمشکل وہاں سے اپنی جان بچا۔ بھگتے در اندر دھڑکے ہوئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ کوئے نے اچھو کے خلاف عہد قتل کا مقدمہ درج کر دیا تھا۔ پولیس اس کے گھر آئی اور اس کے چچا کو پکڑ کر لے گئی۔ کیوں اس شریف آدمی کو حوالات میں رکھا۔ تاہم جس واقعے نے سے ایسی خلیہ بنادیا تھا، نکلنے پر مجبور کیا وہ کوئے کے چھوٹے بیٹے کی اس کی ماں سے ریاضی سے متعلق تو۔ جانے اس نے کیا کہا ہوگا کہ عورت نے جواب میں سر، اراکے بھپڑا کر دیدیا۔ آپے سے باہر ہو کر اس نے عورت کو دھکا دے مار دیا اور خوب ”توبہ“۔

اس واقعے سے کوئی دو ایک ہفتے بعد ایک رات وہ اپنے اباؤں کیوں کے ساتھ اڈے میں بیٹھا تھا کہ اچھو سے اپنے ایک دوست کے ساتھ سوار سوار، چار میں سرمنہ پہنے، وہاں پہنچ کر انہیں مارا ماراں گلی میں سے ہتھولی ہاں ناز کیا۔ ایک ایک گولی کوئے اور اس کے بڑے بیٹے کا کاسٹم سر لگتی۔ چھوٹا سب بچ گیا اور تھڑے سے کوئے کو پھیل گلی میں فرار ہوتا۔ ساری کارروائی آنا نا مولی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ لوگ جاے واردات پر جمع ہوتے، یہ دونوں موٹر سائیکل دوڑاتے اور دونوں پر بچ گلیوں میں ڈار ہوئے۔ اس بار اس نے باوجود قاتل نے چادر میں سرمنہ لپیٹا ہوا تھا پولیس کو ایک سے زیادہ گولیوں کی ٹو سیال میں انہوں نے اچھو کو پھینک دیا تھا۔ کوئے جاتے کا سب سے بڑا بد معاش تھا۔ اس سے قاتل کا پولیس کے ہاتھوں سے بچ گیا۔ پارٹمنٹ کے لئے ڈی سی سی، بات تھی۔ کوئی زیادہ ایک ماہ کی کاٹھ سی۔ کے بعد آخر پولیس چھوٹا رات،۔۔۔ میں کامیاب ہو گئی۔ خبر کی اطلاع پر اس نے بھاری ہمت سے ساتھ اس کا ہاتھ گھیرے میں لے لیا جہاں اچھو چسپا ہوا تھا۔ اچھو کے قتل کی مراد اس کی



خود ہی ہتھیار ڈال دیے۔ پولیس نے اسے جھکڑیاں پہنائیں اور سیدھا تھانے لے جانے کے بجائے دھروٹی ہوئی سوتر منڈی چوک میں لائی جہاں سرعام اس کی پھتر دل کی دھڑکیاں بے دردی سے اسے بازار میں گھسیٹنے لگی۔ وہ جہاں جہاں سے گزرے لوگ اکٹھے ہو جاتے اور جھوم کی صورت میں ساتھ چلتے کہ جیسے سب مل کر اسے اس کے انجام تک پہنچانے جارہے ہوں۔

اس واقعہ کو سال بھر ہونے کو آیا تھا جب نذیر کے عذاب سے لوٹ آنے کا واقعہ ہوا۔

ایک عرصے سے وہ لاپتہ تھا۔ شروع میں تو اس کی اطلاعیں آتی رہیں، لیکن پھر بکسر خاموشی چھا گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ ایک دن وہ اچانک ہی لوہاری گیٹ میں وارد ہوا تو اس کے والد کے دوست جراح لوما پہوان نے اسے پہچانا۔

”اے تو مولوی قادر کا پتر ہے۔“

پہوان نے آگے بڑھ کر نذیر کو گلے لگایا۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس تھا اور کاندھے پر بڑا سا تھیلا لٹکائے ہوئے تھا۔

”لا مجھے پکڑا دے۔“ کوما پہوان عمر میں اس کے باپ سے تھوڑا ہی چھوٹا ہو گا، اس نے زبردستی اس سے تھیل چھین کر خود اٹھالیا۔ پھر کچھ اور لوگوں نے بھی اسے پہچانا اور گلے لگے۔ سبھی جانتے تھے کہ ہارڈ ویئر کی دکان والے مولوی قادر کا بیٹا جہاد پر گیا تھا اور عرصے سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔

”جل میں حیرے ساتھ چلتا ہوں۔“ کوما پہوان اس کے ساتھ ہونیا۔ وہ اس سے جہاد کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوال بھی پوچھتا اور اس پاس لوگوں کو اوپچی آواز میں اس کے بارے میں باخبر بھی کرتا جاتا۔ دو جوانوں نے جو اس کے گرد اکٹھے ہو جانے والی بھیڑ میں شامل تھے، آگے بڑھ کر اسے کندھوں پر اٹھایا۔ آہستہ آہستہ یہ بھیڑ بھینٹ گئی حتیٰ کہ اپنے باپ کی دکان اور پھر محلہ موہلیاں میں اپنے گھر تک پہنچتے پہنچتے یہ بھیڑ ایک جھوم کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ لوگ اشتیاق اور عقیدت سے آگے ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے اور پھر شک سے ایک دوسرے سے کہتے ”وہن بھاگ وہ ماں باپ جن کی ایسی اولاد ہو۔“

”یہ تو نے کیا کیا اچھو؟“ اگلے ہی روز سنٹرل جیل جا کر اس نے رند سے ہوئے نکلے سے پوچھا تھا۔ اچھو پر دو ہرے نکل کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا اور نذیر جانتا تھا کہ فیمل دوست کے حق میں نہیں ہو گا۔ اچھو بہت کمزور اور پٹ مردہ دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پولیس نے اسے خوب زد و کوب کیا تھا۔ اس سے ٹھیک طرح سے کھڑا بھی نہ ہوا جاتا تھا۔ نذیر کی آنکھوں میں وہ زمانہ گھوم گیا جب وہ بے فکری کے آسمان پر آزاد پنچھیوں کی طرح سرور اڑتے تھے۔ روزانہ کرکٹ کھیلنے جاتے، ہنسی مذاق کرتے۔

”میں کل ہی لوہا ہوں۔ تو مجھے حیرے ہارے میں پتہ چلا۔“

”تو تو آگیا۔ شوق پورا ہو گیا حیرا کافروں کو اپنے ہاتھوں مارنے کا

مولوی؟“ اچھو نے زخمی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک بڑھ گئی تھی۔

نذیر کو اس کی بات بری لگی لیکن وہ چپ رہا۔ اس نے سوچا یہ کبھی نہ سدھرے گا۔ جواب دیے کے بجائے اس نے اپنا سوال دہرایا:

”الحمد للہ ہو گیا پورا۔ پرتو نے یہ کیا کیا؟“

”وہی جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔“ اچھو نے مدھم آواز میں کہا، اور جھکن سے نڈھال ہو کر سلاخوں کو پکڑے پکڑے نیچے بیٹھ گیا۔

”لیکن ابھی ایک غم باقی ہے کوہے کا۔ ماں کو کیسے منہ دکھاؤں گا؟“

نذیر تادیر وہاں کھڑا اچھو کو نقابست اور پڑمردگی کے ساتھ سداخوں سے سرٹکائے بیٹھے دیکھتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اچھو کو نیند آ رہی ہو۔ اسے پارٹی حالت زار دیکھ کر نذیر کا دل بھرا آیا اور غصے کا کونڈا اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ وہ باہر آیا۔ اے۔ ایس۔ پی۔ اندرون شہر کارہننے والا تھا اور اسے جانتا تھا، اس کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ نذیر مصافحہ کر کے مڑنے لگا تو اے۔ ایس۔ پی۔ بولا:

”آپ مجاہد لوگ ہیں۔ اللہ کے خاص بندے۔ یہ پیشہ در قافلے ہے۔ ان لوگوں سے آپ کا کیا لینا دینا؟ آپ یہاں نہ ہی آئیں تو بہتر ہے۔“

نذیر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ظہر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے مڑا اور لوہاری گیٹ کی طرف چل دیا جس سے آگے اسے سوتر منڈی چوک کی سمت ہولینا تھا ☆ ☆ ☆

افسانے کی نئی تنقید اور

نظریہ سازی

میں اہم اضافہ

مہدی جعفر کی کتاب

افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں

معیار پبلیکیشنز، گیتا کالونی

دہلی۔ ۱۱۰۰۳۱

قیمت دو سو روپے



دیکھتے دیکھتے ہمارے مقبول اور معروف رسالے "سائنس" نے سو شمارے پورے کر لئے، اور یہ شمارے گندے داراشاعتوں کے نہیں، بلکہ باقاعدہ اور متواتر اشاعتوں کے ہیں۔ یوں تو کسی زبان کی زندگی میں آٹھ دس برس کچھ معنی نہیں رکھتے، اور کسی تہذیب کی زندگی میں تو یہ مدت اور بھی معمولی اور مختصر ہے، لیکن کسی رسالے کی زندگی میں اتنی مدت بھی بڑا زمانہ ہوتی ہے۔ اور اگر وہ رسالہ اردو زبان کا ہو تو یہ زمانہ اور بھی زیادہ طویل محسوس ہوتا ہے۔ اور اگر وہ رسالہ اردو کا "علمی ادبی" رسالہ نہ ہو جس میں تنقیدی مضامین، افسانے اور منظومات وغیرہ اشاعت پذیر ہوتی ہیں، بلکہ "سائنس" رسالہ ہو، یعنی اس کے مشمولات کا موضوع سائنس اور اس کے براہ راست متعلقات ہوں، تو ایسے رسالے کا وجود ہی میں آنا مستبعد ہے، چہ جائے کہ اس کا شائع ہوتے رہنا اور تقریباً ایک دہائی تک زندہ رہ جانا۔ اور ہمارے رسالے "سائنس" کا تو معاملہ یہ بھی ہے کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود اس کے دم خیم میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بلکہ بفضل خدا اضافہ ہی ہوا ہے۔ یعنی اس بات کا پورا امکان ہے کہ جس طرح اس رسالے نے دیکھتے ہی دیکھتے سو شماروں کی خلیج پار کر لی، اسی آب و تاب اور مستعدی سے یہ اگلی صدی کی خلیج بھی پار کر لے گا۔ اس کارنامے کے لئے ہمارے لائق اور محنتی اور خلوص مند مدیر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اور ان کے رفقاء کی جتنی بھی تعریف ہو، کم ہے۔

اردو میں ایک سائنسی رسالہ اور بھی ہے، یعنی کونسل برائے سائنس و صنعتی تحقیق (Council for Scientific and Industrial Research) کا رسالہ "سائنس کی دنیا"۔ یہ بھی دلی سے نکلتا ہے، کم قیمت اور خوبصورت ہے۔ جناب محمد خلیل اس کے مدیر ہیں اور اس رسالے کو شائع ہوتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ دونوں رسالے الگ الگ مقصد کے لئے نکل رہے ہیں اور اپنے اپنے مقصد کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ "سائنس کی دنیا" میں تصویریں اور عام دلچسپی کے مضامین زیادہ ہوتے ہیں۔ ماہنامہ "سائنس" کے مشمولات عام طور پر ذرا زیادہ اختصاص لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

اکتوبر ۲۰۰۳ء / ۲۷۳

مجھ سے پوچھا جائے کہ تمہیں ماہنامہ "سائنس" (مدیر محمد اسلم پرویز) میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟ تو میں بے کھنگلے کہوں گا کہ اس کے وہ صفحات جو سائنسی سوال و جواب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سوالات کا تنوع، بے اوقات ان کی ندرت، اور جوابات کا اکثر و بیشتر شافی و باصواب ہونا میرے لئے ان صفحات میں وہی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو ہم عموماً ناول یا سفرنامے سے حاصل کرتے ہیں۔ سوال جواب کے بعد مجھے وہ صفحے پسند آتے ہیں جن میں نو عمر بچوں بچیوں کی تحریریں چمکتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر میری معلومات میں بہت اضافہ تو نہیں ہوتا، لیکن میری امیدوں میں اضافہ ہوتا ہے کہ یہ بچے بچیاں اردو زبان میں سائنسی علوم کی تو انگریز کا باعث ہوں گے، اور ان کی کوششوں کے باعث سائنسی مزاج، یعنی تھکاتی فکر کے مزاج کو ہمارے یہاں بڑھنے اور پھیلنے، پھلنے پھولنے میں مدد ملے گی۔ تیسرے نمبر پر وہ تحریریں میرے لئے دلکشی اور حصول معلومات کا سبب بنتی ہیں جو مسائل صحت، پھلوں، ترکاریوں، اور پھولوں کے خواص و فوائد کے بارے میں ہوتی ہیں۔

لیکن اس رسالے میں ایک بات مجھے شروع سے کھٹکتی رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کی زبان بعض اوقات غیر معیاری اور خلاف محاورہ ہوتی ہے۔ اور افسوس کہ یہ بات گھٹنے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے یہاں اردو میٹر کا معیار روز بروز (یا روز بروز نہیں تو ماہ بہ ماہ) پست ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ بات بڑی تشویش کی ہے۔ اب ضروری لگتا ہے کہ جناب مدیر تمام مضامین اور مراسلات کو اشاعت سے قبل اس نقطہ نظر سے بغور دیکھ لیا کریں کہ ان کی زبان معیاری ہے کہ نہیں۔ جہاں جہاں زبان کچھ محذو ش معلوم ہو، وہاں وہ اپنے حق مدیرانہ کا استعمال کر کے زبان درست کر دیں۔ یہ بات تو سب پر ظاہر ہوگی کہ خراب زبان میں لکھی ہوئی باتیں چاہے جتنی ہی چچی اور اہم ہوں، اپنا پورا اثر پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ طبیعیاتی سائنسوں (Physical Sciences) مثلاً جوہری طبیعیات (Nuclear Physics) کو اتم طبیعیات

پنجوں میں سے ہندوستانی کیڈمی نے تیار کی اپنی اپنی کتابوں کی نمائش کی۔ افسوس کہ ہندوستانی کیڈمی سے کہ "ہیش پوری ٹرن" "ہندی کیڈمی" بن گئی ہے (اور اس میں کچھ قصور اردو دواوں کا بھی ہے۔ ۱۰۰ کا ٹیب پر دیسیر ہمیشہ اس کا سب سے زیادہ اہم عہدہ دار ہوتا ہے۔ ٹیب کا نام ہے جس میں ہندوستانی کیڈمی

آج تو ذرا ڈھونڈ لائیے، وہ الہ آباد کا نہیں، آکسفورڈ یا علی گڑھ یا قاہرہ کا بی۔ اے۔ پاس ہو، لیکن اسے اتنی مگر یزی، اتنی اردو، اور اتنی سائنس آتی ہو کہ وہ گورکھ پرشاد کی Introduction to Astronomy نہ سکی، فریڈ ہائل کی (Fred Hoyle) The Frontiers of Astronomy یا اسٹیفین ہک (Stephen Hawking) کی A Brief History of Time کا ترجمہ کر دے۔ میں نے ان کتابوں کے نام اس باعث لئے کہ گورکھ پرشاد کی کتاب خاصی تکنیکی اور غار مولوں، نقشوں سے بھری ہوئی ہے، اور ہانگ نے اپنی کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ناشر نے مجھ سے کہا کہ ہر مساوات (Equation) پر تمھاری کتاب کی فروخت نصف ہو جائے گی۔ یعنی اگر مساواتوں سے خالی کتاب کی فروخت ایک ہزار نسخے ہوتی تو ایک مساوات درج کرنے پر اس کی فروخت گھٹ کر پانچ سو رہ جائے گی، دو مساواتیں ہوں گی تو فروخت اڑھائی سو ہوگی، دوس علی ہذا۔ لہذا ہانگ نے اپنی کتاب کو آسان ترین زبان میں لکھا اور







اصطلاحوں کے میدان میں اردو دالے بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔

صدیقی کے آکر موتے ہوتے اسلامی معاشرہ کی چیزوں سے بظاہر خالی ہو جانے پر

PA

ہے۔ درست کہ مغل عہد کے ہندوستان میں سائنس اور ٹکنالوجی دونوں موجود تھیں، اور اگرچہ انھیں ہندوستان میں اتنا فروغ نہیں ہوا تھا جتنا اس زمانے کے یورپ میں ہوا تھا، لیکن مغل دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کا عمل دخل خاصا تھا۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ مغل فلسفہ اور سائنس اور ٹکنالوجی پرانی چیزوں کو بہتر بنانے اور انھیں زیادہ موثر یا ذوق انگیز بنانے ہی میں مصروف تھے۔ نئی چیزوں، نئے سوالات، نئے مسائل سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ اکبر کے زمانے میں چھاپ خانہ یہاں پہنچ چکا تھا۔ لیکن اکبر جیسا بیدار مغز بادشاہ بھی چھاپے خانے کے غیر معمولی امکانات کو نہ دیکھ سکا اور اس نے چھاپے خانے کو قطعی نظر انداز کیا، اس کے فروغ و ترقی کے لئے کوشاں ہونا تو دور کی بات تھی۔ اسی طرح ہندوستانی مابین نفسیات نے روایتی قدیماتی اور طبیعیاتی مشاہدوں اور نظریات میں مزید گہرائی و باریکی تو پیدا کی، لیکن کپلر (Kepler) اور گلیلیو (Galileo) کی دریافتوں سے انھوں نے باطل متنازع کیا، حالانکہ اس کا امکان ہے کہ وہ ان سے واقف رہے ہوں۔

مسلمانوں میں سائنس کے زوال کا ذمہ دار عموماً امام غزالی کی تعلیمات کو خیر یا جاتا ہے۔ امام غزالی کی تعلیمات کو بہت سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

لفظیہ حقائق اور حقیقی حقائق کے مابین امتیاز میں درست، وہاں جہاں لفظیہ حقائق اور حقیقی حقائق کے درمیان تصادم یا تضاد نظر آئے، وہاں لفظیہ حقائق کو پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ خدا سے انسان کو عقل مل رہا ہے، اس کا صحیح استعمال کرے تو اس پرانی الہی و پریم رسالت الہی کی سچائی صاف پائے گی اور دوسرا حانی ہمدی جی عربوں نے حانی حاصل کر لیا، کہ یہی مقصد تحقیق ہے۔ پھر کائنات بھی اس کے قدموں میں ہوگی۔

امام غزالی کا جواب ان کے کوئی دوسرا بعد ابن رشد نے تفصیل سے دیا اور اپنی حد تک اس نے ثابت کر دیا کہ فلسفے کی راجدگی کی وجہ سے علم و حقیقت دور ہوئے۔ اس لئے کہ حقیقی حقائق اور امور (لفظیہ حقائق) سائنس (حقائق میں دلی تباہی ہے، بعد از حق ہے، مختلف رنگ و پیش کرتے ہیں۔ ایک کے سچ ہونے سے دوسرے کا باطل ہونا لازم نہیں آتا۔ دو الگ الگ حقیقتیں ہیں، اور دونوں میں تباہی باہمی ممکن ہے۔ قرآن یک وقت غیر مخلوق و مدکار اور راست علم بھی ہے اور

انسانوں کی دنیا میں ایک صحیحہ بھی ہے جس کا مطالعہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح کسی بھی متن کا مطالعہ ممکن ہے۔ علم و حاکمیت سائنس میں کوئی کمی نہیں، جو اب وہ سامنے ہے۔ مابقی حاکمیت سائنس میں نہ رہی قوت ہے، یعنی قرآن کے اندر ایک مابقی حقیقی بھی ہے۔ ابن رشد کے لئے حقائق ظاہریوں اور حقائق باطنیہ کے قس کے قس کے مطالعہ کے لئے حقیقی حقائق کا مطالعہ

ابن رشد کا عمل خانہ بہت روشن میں سے تباہیت نہ حاصل ہوں۔ جدید سائنسی فکر کی روشنی میں دیکھیں تو ابن رشد کے استدلال میں ایک سائنسی

تھا، کہ اس کے خیال میں کچھ حقائق (سائنسی حقائق) ایسے تھے جن کا وجود معروضی طور پر ثابت تھا، یعنی کچھ حقائق کا وجود کسی مشاہدہ پر مبنی نہیں تھا، اور نہ ان کی نوعیت پر کسی قسم کا شک ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حقائق خارجی کائنات میں اس طرح موجود ہیں کہ وہ بس ہیں (They are out there) انھیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، عقل ان کا وجود ثابت کر سکتی ہے۔ لیکن ابن رشد کے برخلاف، جدید سائنسی فکر کو سائنس کے بارے میں ایسی کوئی غلط فہمی نہیں۔ جدید سائنس جانتی ہے کہ جتنے بھی "حقائق" ہیں، ان کا "حق" یا "حقیقت" ہونا کسی نہ کسی معنی میں اضافی ہے۔ اور بہت سی شیا کے ہیں میں ہمیں قطعیت نہیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا جدید سائنسی فکر کی رو سے ابن رشد کا عمل دھور و رنہ تشکیلی بخش ہے۔

آج کے زمانے میں بعض مسلمانوں کی فکر میں یہ رخنہ نظر آتا ہے کہ اللہ کی کتاب میں سب کچھ صحیح لکھا ہے، اور اس کی صحت کو سائنس کے ذریعہ ثابت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم آج کے ان ایسی تحریریں دیکھتے ہیں (اور افسوس یہ کہ ان میں سے بعض ہمارے زمانے "سائنس" میں بھی چھتی ہیں) جن میں سائنس کی روشنی میں کسی قرآنی آیت یا علم کو "صحیح" ثابت کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سائنس کی روشنی میں ثابت کرنے کے معنی ہیں قرآن کو سائنس کا قصور قرار دینا۔ اصل صورت حال تو یہ ہونی چاہیے کہ سائنس اور قرآن میں کوئی تضاد ہو تو سائنس کو جلد و قرآن کو درست و سائنس کو قرآن کا محکوم ٹھہرایا جائے۔ سائنس کے سہارے قرآن کو "صحیح" ثابت کرنے کی کوشش کے بارے میں مولانا شرف علی صاحب تھانوی نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ ایسی کوششیں غلط اور گمراہ کن ہیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ قرآن اہل ہے، اور سائنس بدلتی رہتی ہے۔ لہذا آج ہم کسی قرآنی آیت کو سائنس کے کسی نظریے کی رو سے صحیح ثابت کریں، اور سائنس بدل جائے، اور سائنس کے جس نظریے کی بنیاد پر آپ نے قرآن کی سچائی ثابت کی تھی، وہ نظریہ خواہی مائل ٹھہرے، تو پھر آپ کا استدلال کہاں گیا؟ جس سائنسی نظریے کے اعتبار سے آپ نے قرآن کو سچ ٹھہرایا تھا، وہ نظریہ ہی غلط ثابت ہو، تو پھر غور، اللہ قرآن بھی غلط ٹھہرا، وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آپ نے ٹھہرا، مولانا نے کہا کہ سائنس تو دم بدلتی رہتی ہے تو پھر آپ کہاں تک اس کی روشنی میں قرآن کی تائیدیں بدلتے رہیں گے؟ سائنس کون کے حال پر چھوڑ دے، قرآن کو اس کا پابند نہ بنایے۔ سائنس کی جس حقیقت کو قرآن نے مغربی انسان نے بہت دیکھا دیکھا کر حاصل کیا ہے، وہ حقیقت ایک اسلامی مفکر کے سامنے بہت پہلے منکشف ہو چکی تھی۔

اب میں نے یہاں یہ کہا ہے کہ ابن رشد نے سائنس اور عقیدہ دونوں کو سینے سے لگا کر جتنی کوشش کی ہے اس سے مسلمانوں میں قیوت نہ حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو خدا کی عقیدہ اور خدا سائنس میں سے ایک چھوٹی کتاب ملی تھی۔ سائنس کے امام غزالی نے قیصر پائل کرتے ہوئے خدا کی عقیدہ کے قتل کیا، اور سائنس کو لحد تک رستہ دکھا دیا۔ لہذا بارہویں صدی میں مسلمانوں میں سائنس کا زوال شروع ہوا، اور سائنس کے تباہیوں صدیوں



میں یہ انخطاط مکمل ہو گیا۔ لیکن کیا یہ بات پوری طرح صحیح ہے کہ مسلمانوں میں سائنس کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عقیدے اور مذہب کو سائنس پر تفوق دیا؟

قبل جدید دنیا میں تین بڑی تہذیبیں تھیں، اور یہ تینوں ہی تہذیبیں سائنس، فلسفہ، اور عقلی کارگزاریوں میں بہت پیش پیش تھیں۔ ایک تو چینی (جس میں جاپانی و کوریائی کو شامل کر کے "مشرق بعید" کی تہذیب کہا جاتا ہے)۔ پھر ہندو، جسے عمومی طور پر "ہندوستانی" کہا جاتا ہے، اور پھر سب سے آخر میں اسلامی، جس کے تحریک اور نامیاتی قوت کا سرچشمہ عرب تھا لیکن جس کی تعمیر میں کئی ملکوں اور روایتوں نے حصہ لیا، اور جس پر یونان و مصرے بھی اثر ڈالا۔ آج کی مغربی سائنس و حکمت جن بنیادوں پر استوار ہے وہ مشرق بعید اور اسلامی تہذیبوں کی فراہم و تعمیر کردہ ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی بھی بہت سی سائنسی، خاص کر طب و ریاضی، مسلمانوں کے ذریعہ مغرب میں پہنچیں اور انھوں نے بھی وہاں کی سائنس اور علوم عقلیہ کے فروغ میں اپنا کردار نبھایا۔ مسلمانوں نے جس طرح یونان کے علوم کو حاصل کیا، انھیں محفوظ رکھا اور ان پر ترقیوں کیس اور نئے علوم ایجاد کئے، اسی طرح ہندو ریاضی، طب، اور فلکیات کو بھی مسلمانوں نے حاصل اور عام کیا۔ اب اس بات کو کٹھن سے کٹھن مغرب پرست بھی تسلیم کرتا ہے کہ مشرق بعید اور اسلام کی تہذیبوں نے مغرب کو ترقی کی ساری راہیں دکھائیں، اور نظری و عملی فکر کی وہ بنیادیں فراہم کیں جن پر مغرب نے اپنی عمارت قائم کر سکا۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے ہندو علوم کو نقصان پہنچایا۔ تاریخ تو بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی آمد نے انھیں اور بھی استحکام بخشا۔ سنسکرت شعریات اور ہندو فلسفہ کے بہت سے عظیم کارنامے مسلمانوں کے ورود ہند کے بعد وجود میں آئے۔ ہندو فلسفہ اور ہندوستانی سائنس (یعنی سائنس سے متعلق وہ کارگزاریاں اور دریافتیں جو ہندوستان سنسکرت بیان ہوتی تھیں) ان کو پھیلنے پھولنے کے جو مواقع تھے وہ مغلوں کے انخطاط کے بعد مفقود نہیں ہو گئے۔ ہندو فلسفہ و شعر میں آخری بڑا کارنامہ عہد شاہ جہاں و اورنگ زیب کے پندت راج لیکن ناتھ کی کتاب "راس گنگا دھر" ہے، اور ہندو سائنس کا آخری بڑا کارنامہ عہد اورنگ زیب و محمد شاہ کی وہ رصد گاہیں ہیں جو سوائی راجہ جے سنگھ نے دہلی اور جے پور میں قائم کیں اور جنھیں آج "جنرل منتر" کے حقارت بھرے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنرل منتر کا ذکر آیا ہے تو اس سے متعلق ایک دلچسپ بات ابھی کچھ دن ہوئے سامنے آئی ہے اور جس سے میرے اس قول کو مزید استحکام پہنچتا ہے کہ ہندوستانی سائنس اور اسلامی سائنس ہمارے ملک میں لازم و ملزوم تھیں، ورنہ کا عروج و زوال ساتھ ساتھ ہوا۔ نصیر الدین طوسی نے ۱۲۶۱ میں اپنی کتاب "تذکرہ فی علم الہیئت" تصنیف کی۔ پھر اس نے ۱۲۷۳ میں صرف "تذکرہ" کے نام سے اس کا ایک نیا اور اضافہ شدہ روپ اپنے شاگردوں کی اعانت سے شائع کیا۔ طوسی نے اس کتاب میں اس بات کا امکان ظاہر کیا کہ زمین اپنے محور پر سورج

کے گرد گھومتی ہے۔ طوسی، اور اس کے ایک شارح ابن الٹطرشٹی کے خیالات سے کوپرنکس (Copernicus) نے استفادہ کیا، لیکن اس نے ان پر ترقی کر کے یہ بھی کہا کہ زمین نظام شمسی کا حصہ ہے اور اس نظام کا مرکز سورج ہے۔ نظام شمسی کے تمام سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ طوسی کی ایک شرح عبدالحی بن محمد بن حسین البرجندی (al-Birjandi) نے ۱۵۲۰ کے آس پاس لکھی۔ اس شرح میں البرجندی نے طوسی کے مقصین، خاص کر قطب اللہ شیرازی کے خیالات سے بھی بحث کی۔

طوسی کی کتاب کے گیارہویں باب میں بعض ایسے مسائل پیش کئے گئے تھے جنھیں قطب الدین شیرازی، در پھر کوپرنکس نے استعمال کیا۔ سوائی راجہ جے سنگھ نے ۱۷۴۹ میں طوسی کے "تذکرہ" کا یہی گیارہواں باب، اور اس پر البرجندی کی شرح کا سنسکرت میں ترجمہ کرایا۔ سنسکرت مترجم نہیں سکھاپا دھیاے کو عربی نہیں آتی تھی، لہذا ایک مسلمان عالم محمد عابد نے البرجندی کے متن کا مظاہرہ لفظ ترجمہ "ہندی" (یعنی اردو) میں پنڈت نمین سکھ کو سمجھایا اور پنڈت نمین سکھ نے اسے معیاری سنسکرت میں منتقل کیا۔ عربی اصطلاحات کے معنی سمجھ کر نمین سکھ نے ان کے سنسکرت متبادل لکھے، اور جہاں سنسکرت متبادل نہیں تھے، وہاں انھوں نے سنسکرت متبادل وضع کئے، یا پھر عربی اصطلاح کو ناگری رسم الخط میں لکھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سوائی راجہ جے سنگھ نے البرجندی کے گیارہویں باب ہی کو ترجمے کے لئے منتخب کیا۔ انھیں کوپرنکس کے بارے میں کچھ معلوم نہ رہا ہوگا، اور نہ وہ یہی جانتے رہے ہوں گے کہ البرجندی کے خاص ہی باب کے تصورات و اشکال نے کوپرنکس کو متاثر کیا تھا۔ اگر مغلوں کے زوال کے ساتھ ہندوستانی و اسلامی سائنس کا زوال ہندوستان میں نہ ہو گیا ہوتا تو ممکن ہے کہ نمین سکھ کے ترجمے کا کوئی طالب علم طوسی، قطب الدین شیرازی، البرجندی، نمین سکھ، در کوپرنکس کے درمیان ربط و موند لیتا اور ہماری سائنس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا۔ نمین سکھ کا سنسکرت اور البرجندی کا عربی متن ب انگریزی میں ترجمہ ہو کر آسانی سے دستیاب ہیں۔ اس معاملے کی تفصیلات جامعہ ہمدرد کے رسالے Studies in History of Science and Medicine (۷۲ پر الطائف احمد اعلیٰ) کے شمارہ نمبر ۱۲، بت جولائی-دسمبر ۲۰۰۲ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ بات قابل لحاظ ہے علوم عقلیہ کی روایت اوائل انیسویں صدی تک دہلی اور اردو میں یک حد تک قائم رہی۔ اردو میں خان علامہ تفضل حسین خان نے اپنی پڑھی درنون کی Principia کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ گورکھپور کے حامد رحیم نے بھی لاطینی اور انگریزی پڑھی اور اردو فارسی میں علمی کارنامے ایسے دیئے۔ لیکن یہ ٹھنڈے ہوئے چراغ کا آخری سنہبلا تھا۔ افسوس کہ اس وقت تک ہماری "نکھیں انگریزی بالٹیوں سے اس درجہ خیرہ ہو چکی تھیں کہ ہم نے اس "خری سنہبلا" کی طرف دیکھ بھی نہیں۔

یہ تاریخ کا عجیب واقعہ ہے کہ مشرق بعید اور اسلام کی تہذیبوں میں سائنس اور علوم عقلیہ کا زوال کم و بیش ایک ہی زمانے میں، یعنی سولہویں و سترہویں



صدی سے شروع ہوا۔ ہندوؤں کا زوال تو مغل تہذیب کے زوال سے وابستہ ہے، کیوں کہ مغل دور میں ہندو فلسفہ و فکر کو پھولنے کے پورے مواقع میسر تھے۔ لہذا معاصرین یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سائنس کا زوال کیوں ہوا؟ معمایہ بھی ہے کہ مشرق بعید میں سائنس کا زوال کیوں ہوا؟ وہاں تو مذہب اور سائنس میں کوئی تصادم نہ تھا، کیونکہ ان کا مذہب (بدھ مذہب اور اس کی مختلف شکلیں) خدا کے تصور سے بیگانہ ہے، لہذا وہاں فلسفیانہ اور سائنسی تفتیش میں خدا کو منہا کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اور تیسرا معمایہ یہ ہے کہ ان دونوں تہذیبوں میں علوم عقلیہ کا زوال کم و بیش ایک ہی وقت میں کیوں شروع ہوا؟

اس کا آسان جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مغرب کی برتری کا آغاز ہوا تو مشرق کی بارہتی کا بھی اختتام داری تھا، یعنی مغرب کی بلندی اور مشرق کی پستی ہم معنی ہیں۔ یا یوں کہیں کہ مغرب کے عروج نے مشرق کا زوال پیدا کیا۔ لیکن یہ جواب غیر منطقی ہے۔ تاریخ یا فلسفہ یا سائنس کا ایسا کوئی اصول نہیں جس کی رو سے ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہو۔ تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم میں کئی تہذیبیں ایک ساتھ پھل پھول رہی تھیں۔ سب سے نمایاں مثال تین چار سو برس قبل مسیح کے ہندوستان، یونان، اور چین ہیں کہ سب اپنے اپنے طور پر بیک وقت عروج پر تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مشرق کا زوال اس وجہ سے ہو کہ مغرب اس پر غالب آ گیا تو اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ اول تو یہ کہ مشرق بعید کی تہذیبوں پر مغرب کا غلبہ عیسویں اور بیسویں صدی میں ہوا، اور علم و دانش کا رداں، یا زوال نہیں تو ٹھہراؤ درجہ، یہاں سولہویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ یعنی سولہویں صدی کے بعد چین میں سائنسی و علمی معامات کو فروغ نہ ہوسکا۔ دوسری بات یہ کہ مشرق وسطیٰ اور ہندوستان اور افریقہ پر مغرب کا غلبہ ہوا ہی کیوں؟ یہ تو نہیں ہے کہ غلبہ پہلے ہو اور زوال بعد میں؟ حقیقت یہی ہے کہ ان اقوام کا زوال ان پر مغرب کے حملے کے باعث نہیں شروع ہوا۔ ان کے زوال کے باعث ان پر مغرب کا غلبہ ہو سکا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مغرب کی بارہتی قائم ہو جانے کے بعد ان تمام مملکتوں کے اصل درروایتی علوم و فنون میں مزید زوال پیدا ہو جاتا، حتیٰ کہ بعض چیزیں (خاص کر روایتی صنعت، حرفت، اور تکنالوجی) تو بالکل ناپید ہی ہو گئیں۔

مسلمانوں میں سائنس کے زوال پر مشرقی مملکتوں کے باہر شاید زیادہ غور نہیں کیا گیا، لیکن مشرق بعید کے معاملے پر مغرب میں مشہور ماہر سماجیات ماکس ویبر (Max Weber)، درمیان کے بعد کئی مفکرین نے غور کیا، لیکن تشفی بخش جواب کسی سے نہ بن پڑا۔ مثلاً ویبر نے کہا کہ سولہویں صدی سے چین میں قدامت پرست نوکمرشاہی (Conservative Bureaucracy) کا حکم چلے گا۔ ان لوگوں کا طریقہ ”عملی عقلیت پسندی“ کا تھا۔ مرن کے زیر اثر ملک میں ”عقلیت پرست مہم جوئی“ (Rationalist Mission) کا خاتمہ ہو گیا، پہلے سے قائم شدہ چیزوں پر قناعت کر لی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس جواب میں سب سے بڑی کمی ہے کہ اس کے زوال کے، سبب بیان کرے میں استدلال کو یک قدم

پیچھے دھکیل دیا ہے، اور بس۔ یعنی زوال اس وجہ سے ہو، کہ نوکمرشاہی قدامت پرست اور حاکموتور تھی۔ لیکن یہی نوکمرشاہی پہلے تو روشن خیالی اور ترقی پذیری کی ضامن تھی۔ پھر اسے کیا ہو گیا جو اس نے قدامت پرستی کا جھنڈا اٹھایا؟ ماکس ویبر کے یہاں اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ بعض دوسرے مفکرین کا کہنا ہے کہ چینوں نے ”لفظ“ (Word) کی جگہ ”طریق“ (Way) کو اختیار کیا۔ اگر وہ ”لفظ“ کو اختیار کرتے تو اشیاء کے پیچھے جو حقائق ہیں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ لیکن انھوں نے ”طریق“، یعنی عملی راہ کو اختیار کیا۔ یعنی انھیں اس بات کی فکر نہ تھی کہ اور اکالت کی تہ میں جو حقائق ہیں انھیں دریافت کیا جائے۔ اس کی توجہ اس بات پر رہی کہ ان چیزوں کو حاصل وراثت پر کیا جائے جن سے عملی زندگی کو پراسن طریقے سے گزارا جاسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس جواب میں، اور ویبر کے جواب میں کوئی خاص فرق نہیں، اور دونوں ہی جو بات میں یہ کمزوری ہے کہ استدلال ایک درجہ پیچھے دھکیل دیا گیا ہے، اسے اصل آغاز تک نہیں پہنچایا گیا۔ اگر سولہویں صدی میں چل چل کر ”لفظ“ کو ترک یا اور ”طریق“ کو اختیار کیا، تو سولہویں صدی میں یہ کیوں ہو؟ اور ”لفظ“ اور ”طریق“ کی تفریق تو چینی فکر میں ہمیشہ رہی اور اول سے تھی۔ پھر اس کے ”خراب“ نتائج سولہویں صدی ہی میں کیوں ظاہر ہوئے؟ اس خلدون نے قوموں کے عروج اور زوال کا جو فلسفہ بیان کیا تھا، اس کا بنیادی نکتہ کم و بیش یہی تھا کہ قبائلی سماج جب شہری سماج میں بدلتا ہے تو وہ اپنے استحکام اور توسیع کی راہیں ڈھونڈتا ہے، پھر جب اسے ممالکوں، مہاجر مملکتوں اور ریاستوں کی طرف سے یک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے تو وہ اندرونی امن و سہمتی اور معاشرتی ہمیش و عشرت کی راہ اختیار لیتا ہے، اور وہیں سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ابن خلدون کا یہ تہذیبی چرخ (Cultural Cycle) کسی معاشرے میں سائنس و عقل کے انحطاط کے لئے ایک سے کوئی وجہ نہیں بیان کرتا۔ اور چین کی تہذیب کو اپنے قبائلی عہد سے نکلے ہوئے کوئی تین ہزار برس ہو چکے تھے جب اس کا زوال شروع ہوا۔

ظاہر ہے کہ مشرق بعید کی تہذیبوں کے عروج و زوال کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے دلچسپ ہے اور شاید سبق آموز بھی، لیکن مسلمانوں میں سائنس کے زوال کی وجہیں کہیں اور ہیں، اور ہمیں ضرور ہے کہ ہم انھیں تلاش کریں اور سمجھیں۔ فی الحال میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ صرف مذہب سے شغف، اور فلسفہ (یعنی علوم عقلی اور سائنس) کا انحصار کر کے ماخذا ہو جانے کا خوف اس زوال کی توجیہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

دوسری بات جسے کہنا میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سائنس کا زوال تو ہوا ہی، لیکن ان رشتہ کے بعد ہمارے یہاں کسی فلسفہ سائنس کا بھی ارتقاء نہ ہوا۔ ملا صدرا نے فلسفہ کو مابعد الطبیعیات سے آگے لے جا کر روحانیات، یا ایک طرح کی اشراقیت سے ملا دیا۔ اس طرح انھوں نے ایک مسئلہ قائل کیا، کہ عقل اور کشف ایک منہ پر ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے دوسرا مسئلہ حل نہیں کیا، بلکہ اسے اور پیچیدہ کر دیا۔ عملی زندگی میں عقل کا کیا مقام

ہے؟ فلسفے کے حقائق کی نوعیت کیا ہے؟ ان حقائق سے مسائل کا استنباط کر کے ہم عملی فائدے حاصل کر سکتے ہیں، لیکن کیا ان سے ہمیں کائنات کے بارے میں کچھ مستحکم علم حاصل ہو سکتا ہے؟ خود علم کیا چیز ہے؟ ملاحظہ رانے ان سوالوں کو اٹھایا نہیں۔ لہذا ہم لوگ یہ مسئلہ بھی حل نہ کر سکے کہ علوم عقلی یعنی سائنس سے جو عملی نکات ہمیں مستفاد ہوتے ہیں، کیا ان کی سچائی مطلق ہے، اور کیا یہ تمام کائناتوں کے لئے برابری سچائی ہے؟ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے نکات علمی کی حیثیت صرف نظری اور موضوعی ہو؟ یا مختلف کائناتوں میں سچائیاں (یعنی سائنس کے قوانین) ہماری کائنات سے مختلف ہوں؟

مغربی سائنس سے ہم لوگوں کا مفصل تعارف انیسویں صدی میں ہوا۔ یہ زمانہ مغربی سائنس کے اختر (Hubble) کا زمانہ تھا۔ سائنس دان یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم اہل سچائیوں کو دریافت کر رہے ہیں اور یہ سچائیاں ہر زمان و ہر مکان میں سچ ہیں اور سائنسی مشاہدہ (Observation) اپنی جگہ پر تراویقیت ہے، وہ مشاہدہ (Observer) کی ذہنی یا روحانی یا جسمانی صورت حال سے متاثر نہیں ہوتا۔ لہذا اقرار واقعی مشاہدے موجود ہوں تو ان سے حقیقت کا استنباط ہو سکتا ہے، اور اس استنباط کی بنا پر پیشین

گوئیاں کی جا سکتی ہیں۔ اور ان پیشین گوئیوں کو تجربے (Experiment) کے عمل سے گزر کر نظری حکمت (Theory) کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ تصور بھی عام تھا کہ زبان کسی نہ کسی سطح پر حقیقت کا بیان کر سکتی ہے۔ یعنی انیسویں صدی کی سائنس تئیس اور خود اعتمادی اور عقل کی قوت پر مطمئن ہونے اور مطمئن رہنے کی سائنس تھی۔ عقل کے بارے میں خیال تھا کہ یہ عقیدے سے برتر ہے اور مشاہدے کے بارے میں خیال تھا کہ یہ کشف سے بہتر ہے۔ اور زبان کے بارے میں خیال تھا کہ یہ ریاضی کی سطح پر ریاضیاتی انداز میں معروضی طور پر حقائق کا بیان کر سکتی ہے۔

سائنس کا یہ فلسفہ آج بڑی حد تک غلط ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے جس طرح انیسویں صدی کے نظریاتی تصورات یا سست ملکی دہائی کو کھٹے دل سے قبول کیا، اسی طرح ہم نے انیسویں صدی کے انگریزی (یا مغربی) فلسفہ سائنس کو قبول کیا۔ اب ہر اس فلسفے میں خدا، نبوت، وحی، کشف، تزکیہ، نفس، معاد، وغیرہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ سرسید نے چاہا کہ قرآن کی سائنسی توجیہ کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ ناکام ہوئے (جس طرح آج کے لوگ اس قسم کی کوششوں میں توج پھر ناکام ہو رہے ہیں)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے یقین کر لیا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی نقطہ اتفاق نہیں، سائنس پر جسے سے یہاں چلا جاتا ہے۔ اور مذہب ہے عقل سے مقابلے میں ایمان رہا، وحشی ہے۔ سائنس سے کی خوب کی بنا پر بعض مسلمان علماء کو مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ سائنسی حقائق اور علمانی کوہ تا قہقحک ہے، ایمان جو سائنس پر ہٹا نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی غیر علمی خیالات ہیں۔ اور اصل مسئلہ سے مٹھو چھپا دیں یہ جو علمی نزاع ہے۔ سائنس کیسے۔ خدا وین۔ سائنس سے میدان میں لڑنا میں ہٹا ہے۔ یہ وہی یہ ہیں۔

تکنی لوجی اور سائنس، تکنی لوجی اور تہذیب، تکنی لوجی اور نئے تصورات، یہ سب ایک ساتھ چلتے ہیں۔ انٹرنیٹ اس کی نمایاں مثال ہے۔ نوبل انعام یافتہ مشہور سائنس دان اسٹیون وائن برگ (Steven Weinberg) نے لکھا ہے کہ روزیج پہلا کام میں یہ کرتا ہوں کہ کمپیوٹر کھول کر لاس آلامس (Los Alamos) کی ویب سائٹ پر جاتا ہوں کہ دیکھوں کل سے آج صبح تک کے دور رسے میں نظری طبیعیات (Theoretical Physics) میں کون سی نئی باتیں ظہور میں آئی ہیں۔

اگر ہم جدید فلسفہ سائنس کا مطالعہ کریں، یا جدید سائنسی افکار کو دیکھیں، تو ہمیں معلوم ہو گا کہ سائنس کی وہ قطعیت، اور اس کا دعویٰ کہ وہ "اٹل حقائق" سے معاد کرتی ہے، اب باطل ہو چکا ہے۔ آج کی سائنس بھی اپنے طور پر کشار، شکوک اور شبہ یعنی کے دور سے گذر رہی ہے۔ اور یہ دور غالباً ہمیشہ قائم رہے گا، کیوں سائنس کے بارے میں ہمارے تصورات اب بدل چکے ہیں۔ اب سائنس کو مذہب کے لئے کوئی بہت طاقتور چہرہ نہیں کہا جاسکتا۔ اب سائنس میں اس طرح کا قوس کی استعجاب کا، عٹ نہیں بنتا کہ "حقیقت (خواہ وہ جانی جا سکتی ہو یا نہیں) اور اس کے پیکر (Image) کے درمیان ایک خلیج ہے۔"

اب فلسفہ سائنس اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سائنسی بیانات بھی محض بیانیہ، اعظم (Grand Narratives) ہیں۔ یعنی جس طرح فلسفہ یا مذہب کائنات کو بیان کرنے، یعنی اس کی تصویر کھینچنے اور اس کے اسباب وطل کی داستان بیان کرنے کا اعظم الشان طریقہ ہیں، سائنس بھی اسی طرح کا بیانیہ اعظم ہے۔ خواہ وہ ارتقائی حیاتیات (Evolutionary Biology) ہو یا نظریہ

اضافیت (Relativity)، کونیات (Cosmology)، یا کوانٹم طبیعیات (Quantum Physics)، یہ سب تمام دوسرے بیانیوں کی طرح ناقص ہیں اور زبان کے مقوم ہیں۔ ان علوم کو حقیقت اصلی سے اسی قسم کا تعلق ہے جو کسی طرح Irony اور اصل صورت حال میں ہوتا ہے۔ طنز یا (Irony) کا تعامل یہ ہے کہ وہ لفظ اور حقیقت کے مابین خلیج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً غالب۔

مراڑا نے کے جو دھڑے کو مکرر چاہا

نفس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

یہاں "ترے سر کی قسم" اور اصل حقیقت کے درمیان ایک تفاوت ہے۔ ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آیا اس فقرے کے متکلم کی مراد یہ ہے کہ "ہم تمہارے سر کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم تمہارا سر کاٹ کر دیں گے۔" یا متکلم کی مراد یہ ہے کہ "ہم تمہارا سر نہ کاٹنے کی قسم کھاتے ہیں [لہذا ہمارا وعدہ محض طفل نسلی تھا]۔" یا اس کی مراد یہ ہے کہ "ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہارا سر ضرور کاٹیں گے۔" اصل معنی یہ ہے کہ متکلم و معلوم ہیں، ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ اصل معنی کیا ہیں۔ "نفس وقت" ان طبعی یوں پیدا ہوتا ہے کہ اصل معنی متکلم کو درپاس کھڑے ہوئے سننے والے کو (مثلاً ذرا سے کے سامع کو) معلوم ہوتے ہیں، لیکن مخاطب کو نہیں معلوم ہوتے۔

سائنسی بیانات کے بارے میں اعتراف، کہ وہ بھی دیگر بیانات کی



طرح ہیں، یعنی سچائی ان کے اندر ہے، بیان کے باہر ہے، انہیں سب بات کا احساس دلاتا ہے کہ حقیقت کے دوسرے ممکن سرچشمے اور خزانے، مثلاً اسطور (Myth)، مذہب، شعر و ادب، اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انہیں انسانی معاملات میں وہ جگہ دلائی جائے جس کا انہیں استحقاق ہے، اور صدیوں کی عقلیت پرستی نے جس سے انہیں بے دخل کر دیا ہے۔ (بقول لوی بیکسٹ (Lacy Becket) اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سائنسی (یعنی مذہبی) یہ عقلمندی میں یہ سچائی پوشیدہ ہے، بدشاید اس میں سچائی کا کچھ جز، بدشاید ان پر کچھ پوشیدہ ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ دو نتائج نکلتے ہیں:

(۱) سائنس کے بیانات اہل اور مطلق اور تین سے بھرپور ہیں جیسا کہ انہیں نے خیال کیا تھا، اور جیسا کہ ہم انیسویں صدی کے مغربی تصورات کے زیر اثر سمجھتے آئے ہیں۔

(۲) مذہب کے بیانات میں بھی سچائی کے پوشیدہ ہونے والا ان کے پر پر کچھ پوشیدہ ہوا ہے۔

مندرجہ بالا نتائج لاخدا سائنس کی زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ سائنس جو خدا کے وجود میں یقین رکھنے کو ریاست حقیقت کے سامنے رکھتی ہے کہ سائنس کے مشابہت خدوں اور تانہ نہایت کے لئے خدا کے وجود کا سہارا لیتا، یا خدا کو مرافعہ کی آخری عدالت (Court of Last Appeal) قرار دیتا ضروری نہیں۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ خدا موجود ہے، تو ان نتائج کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جائے گا:

(۱) سائنس کے بیانات اہل اور مطلق اور تین سے بھرپور نہیں ہیں، جیسا کہ انہیں نے خیال کیا تھا، اور جیسا کہ ہم انیسویں صدی کے مغربی تصورات کے زیر اثر سمجھتے آئے ہیں۔

(۲) سائنس کے بیانات اسی وقت تک سچے ہیں جب تک وہ غلط نہیں ثابت ہو جاتے۔ سائنس کے بیانات میں کج کا امکان ہے، یہ بات ثابت نہیں کہ ان میں سب کچھ سچ ہے۔ سائنس کے بہت سے نظریات اور پیشین گوئیاں عام یا میں کج ثابت ہوتی ہیں، میں اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نظریات اور پیشین گوئیاں مفقود اور سچ ہیں۔

(۳) مذہب کے بیانات اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ خدا کا وجود ہے۔ سائنس کا کوئی بیان خدا کے وجود کا عدم نہیں قرار دے سکتا، یہ سائنس تمام بیانات خود ہی غیر مطلق و راعتی ہیں۔ خدا کے وجود میں یقین رکھنے والے عقیدہ ہے کہ مذہب کے بیانات سچ ہیں۔

(۴) لہذا سائنس کے ذریعہ مذہب کی بے دخلی ممکن نہیں، اور نہ مذہب ہی سائنس کو بے دخل کر سکتا ہے۔ یعنی اگر مذہب کا کوئی بیان سائنس سے متعارف ہو تو بھی مذہب کے بارے میں صرف یہ کہا جائے گا کہ یہ سائنس سے مختلف عالم کی بات ہے، لیکن دونوں سچ بھی رہ سکتے ہیں، اس معنی میں کہ سائنس یہ نہیں کہتی کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ سائنس صرف یہ کہتی ہے کہ خدا کے وجود کو ثابت

نہایت سادہ اور سادہ میں شامل ہے۔ خدا کو معروض بحث میں لائے بغیر بھی سائنس کے مسائل پر بحث ہوتی ہے۔

(۵) اس شدت میں سائنس مذہب کی نسبت زیادہ سادہ ہے۔ سائنس میں سچائی کی باتیں سادہ ہیں، مذہب میں سچائی کی باتیں سادہ ہیں۔

آپ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ سادہ اور سادہ ہے۔ سائنس میں سچائی کی باتیں سادہ ہیں، مذہب میں سچائی کی باتیں سادہ ہیں۔

(Existence اور بقا کے اقویٰ (Survival of the fittest) اور جینیاتی تغیر (Mutation of the Gene) وغیرہ کی جو باتیں کہی ہیں وہ سب سادہ ہیں۔ سائنس کے بیانات سادہ اور سادہ ہیں۔ سائنس میں سچائی کی باتیں سادہ ہیں، مذہب میں سچائی کی باتیں سادہ ہیں۔

مندرجہ بالا نتائج لاخدا سائنس کی زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ سائنس جو خدا کے وجود میں یقین رکھنے کو ریاست حقیقت کے سامنے رکھتی ہے کہ سائنس کے مشابہت خدوں اور تانہ نہایت کے لئے خدا کے وجود کا سہارا لیتا، یا خدا کو مرافعہ کی آخری عدالت (Court of Last Appeal) قرار دیتا ضروری نہیں۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ خدا موجود ہے، تو ان نتائج کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جائے گا:

(۱) سائنس کے بیانات اہل اور مطلق اور تین سے بھرپور نہیں ہیں، جیسا کہ انہیں نے خیال کیا تھا، اور جیسا کہ ہم انیسویں صدی کے مغربی تصورات کے زیر اثر سمجھتے آئے ہیں۔

(۲) سائنس کے بیانات اسی وقت تک سچے ہیں جب تک وہ غلط نہیں ثابت ہو جاتے۔ سائنس کے بیانات میں کج کا امکان ہے، یہ بات ثابت نہیں کہ ان میں سب کچھ سچ ہے۔ سائنس کے بہت سے نظریات اور پیشین گوئیاں عام یا میں کج ثابت ہوتی ہیں، میں اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نظریات اور پیشین گوئیاں مفقود اور سچ ہیں۔



یعنی نہیں۔

ملاحظہ ہو کہ سائنس کے بارے میں جو بات مغرب والے اب کہنے لگے ہیں (کہ سائنسی بیانات مطلق نہیں، احتمالی نوعیت کے ہیں)، اسے علامہ شبلی نے کوئی سو برس پہلے (۱۹۰۷ء میں) کہہ دیا تھا۔ اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ علامہ کو اس رائے میں کوئی غم ہی قباحت نہیں نظر آتی کہ ”پہلے صرف نوع پیدا ہوئی، وہی ترقی کرتے کرتے انسان کا حد تک پہنچ گئی۔“ شبلی کی نظر میں یہ رائے، اور قرآن پاک میں بیاں کردہ تخلیق آدم و حوا کی روایات، کوئی تضاد نہیں پیدا کرتیں۔ اگر وہ خیال کرتے کہ یہاں تضاد ہے، تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔

آگے چل کر علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ اخوان الصفا کے اراکین کے نظریات حسب ذیل تھے (ص ۶۹-۷۳):

(۱) نباتات کا انتہائی درجہ حیوانیت کے ابتدائی درجے سے متصل ہے، اور حیوانیت کا انتہائی درجہ انسانیت کے ابتدائی درجے سے ملا ہوا ہے۔  
(۲) نباتات میں ایسے بھی ہیں جو جسم کے اعتبار سے نبات اور فطرس کے اعتبار سے حیوان ہیں۔

(۳) سب سے کم درجے کا حیوان وہ ہے جس کے صرف ایک حارہ ہوتا ہے۔ اس کے کان، آنکھ، شامہ، ذائقہ، کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ کٹر کڑے جوہلی میں اور دریاؤں کی تہ میں پیدا ہوتے ہیں، اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

غور کیجئے، کون کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ بالا خیالات میں ارتقا (Evolution) اور آغاز حیات کے ذہنی تصورات کی جھلکیاں نہیں نظر آتیں؟ شبلی مزید لکھتے ہیں کہ ابن مسکویہ نے بھی اس سسے پر کلام کیا ہے۔ ابن مسکویہ کہتا ہے (ص ۷۳-۸۰):

(۱) جماد کا آخری درجہ نبات ہے۔ گھاس کا درجہ جماد اور نبات کے درجے میں ہے۔ پھر نباتات میں قوت حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ اتنی ہو جاتی ہے کہ اس کی شاخیں ہوتی ہیں، وہ پھیلتا ہے اور ختم کے ذریعہ اپنی نسل کی حفاظت کرتا ہے۔

(خیال رہے کہ تنازع البقا کی بحث میں تنازع البقاے نفس کی جگہ تنازع البقاے نسل یعنی ”نسل کی حفاظت“ کا تصور ہمارے زمانے میں رچرڈ ڈاکن (Richard Dawkin) نے سائنسی طور پر بیان کیا اور اسے ”خود غرض جین“ (The Selfish Gene) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔)

(۲) نبات جب اپنی منزل سے آگے بڑھتا ہے تو اس کا پہلا زینہ یہ ہے کہ زمین سے الگ ہو جائے، تاکہ وہ اختیاری حرکت کر سکے۔

(یہ بھی خیال رہے کہ جدید سائنسی بحثوں میں ”زندہ“ اور ”غیر زندہ“ (Life and non-life) میں فرق کرنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ ”زندہ“ کو حرکت ہے اور ”غیر زندہ“ کو حرکت نہیں۔)

(۳) حیوان ترقی کر کے انسان کی سرحد میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ

درجہ بندر وغیرہ کا ہے جو انسان سے بالکل مشابہ ہیں اور ان میں اور انسان میں تھوڑا سی فرق ہے، جس کو بندر اگر طے کر لیں تو بالکل انسان ہو جائیں۔

(واضح رہے کہ جدید جینیات (Genetics) کے مطابق انسان اور چمپانزی کے درمیان ۹۹.۹۹ فی صدی جین مشترک ہیں۔ یعنی صرف اعشاریہ ایک فی صدی جین ہمارے جسم میں ایسے ہیں جو چمپانزی کے جسم میں نہیں ہیں۔) آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اخوان الصفا اور ابن مسکویہ نے نظریہ ارتقا کا تقریباً خاکہ ہی بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں تنازع البقا (Struggle for Existence) اور بقاے اقویٰ (Survival of the Fittest) اور جینیاتی تغیر (Mutation of the Gene) کے تصورات نہیں ہیں، لیکن بنیادی خاکہ سب موجود ہے۔ علامہ شبلی اپنے مضمون کے آخر میں نظمی عروضی کے اقتباسات پیش کرتے ہیں:

(۱) جس قدر حاسے کم ہوں گے، اتنا ہی کم درجے کا وہ ناقص حیوان ہو گا۔ کچھ سے زیادہ کوئی ناقص حیوان نہیں ہوتا۔

(۲) بن مانس انسان کے بعد تمام حیوانات میں ترقی یافتہ ہے۔

اب آخر میں بیدل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں

پچھلے بے بیولی قابل صورت نہ شد

آدی ہم پیش از آں کا دم بود بلا زینہ بود

(او کی خاک نہ ہو تو کوئی بھی شکل صورت پذیر نہیں ہوتی۔ خود انسان پہلے بندر تھا، پھر انسان بنا۔)

یہ خیالات جن لوگوں کے ہیں ان کے بارے میں، یا ان خیالات کے بارے میں، کسی نے نہیں کہا کہ وہ غیر اسلامی ہیں۔ درود سائنس دان جو خود کو ”خلیق پسند“ (Creationist) کہتے ہیں، ان کو بھی لوگ سائنس دان ہی مانتے ہیں۔

ممکن ہے یہ بات اب کچھ واضح ہو چلی ہو کہ مذہب اور سائنس چاہے یک جہ نہ ہو سکیں، لیکن ایک دوسرے کی راہ میں ہار ج بھی نہیں ہیں۔ فلسفہ سائنس کے جدید نظریات کو ملحوظ رکھیں تو مذہب کی باہمی سے سائنس کی تکذیب لازم نہیں آتی۔ ہم اگر جدید فلسفہ سائنس کو اختیار کر لیں تو ہمارے لئے علوم عقلیہ میں ترقی کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ ☆☆☆

## رضوان الحق

طالب اور اس کی بیوی صبح گھر میں تہہ ہوئے بیٹھے تھے۔ جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اس کا خوف بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ان تو کسی طرح کٹ گیا تھا لیکن اب یہ جنگل ہی رات کیسے کٹے گی؟ یہ سوچ سوچ رہا کہ ال کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ انھوں نے گھر کو چاروں طرف اس ظاہر کرنے کے لیے کمر کی ایک بھی روشنی نہیں جانی تھی، حتیٰ کہ مچس کی ایک تیلی بھی روشن کرنے کا جو حکم سیں لیا تھا۔ دو پہر تک وہ ٹی۔وی۔ پر خبریں سننے رہے تھے لیکن جب ان سے وہ منظر دکھائے گئے تو ٹی۔وی۔ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

کسی بھی طرح کے حملے کا امکان تھا۔ اور مختلف قسم کے حملوں سے بچنے کے لیے وہ صبح سے کئی منصوبے بنا چکے تھے۔ لیکن تھوڑی سی دیر بعد وہ سارے منصوبے غیر محفوظ محسوس ہونے لگتے تھے۔ پیسے انھوں نے سوچا تھا کہ گھر کو بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے اور سارا اوپری معمولی سامان توڑ پھوڑ کر ادھر ادھر پھینک دیا جائے اور خود کسی معقول جگہ پر چھپ جایا جائے۔ اس طرح اگر کوئی آئے گا بھی تو یہی سمجھے گا کہ یہ گھر نہ چکا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد طالب کو خیال آیا کہ اس طرح تو حملے کا کوئی بھی شخص یہ سوچ کر آسکتا ہے کہ چلو دیکھیں ممکن ہے ابھی کچھ سامان بچ گیا ہو، اسے کیوں چھوڑا جائے؟ اور مان لیا یہاں آکر وہ شخص ایک ایک کونا تلاش کرنے لگے؟ ایسے میں اگر ہم لوگ مل گئے تو پھر تو وہ مار ہی ڈالے گا۔

پھر ان دونوں نے ایک منصوبہ یہ بنایا کہ گھر کے کسی ایک حصے میں آگ لگا دی جائے لیکن جو خامیاں پچھلے منصوبے میں تھیں وہ اس میں بھی موجود تھیں۔ ساتھ ہی ایک خطرہ اور بھی تھا کہ اس سے لوگوں کا دھیان خواہ مخواہ ہمارے گھر کی طرف جائے گا۔ یہ منصوبہ بھی خارج ہو گیا۔

جب اندھیرا پوری طرح مسلط ہو گیا تو ایک نئے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے طالب نے صدر دروازے پر جا کر باہر سے تالا بند کر لیا، گھر سے باہر نکل کر پھوڑے ایک شکستہ سی پرانی میز مٹی تھی۔ اس کا باہری دروازہ وہ بھڑا ہوا چھوڑ آیا تھا۔ اس میز مٹی کے ذریعہ چھت پر چڑھ کر وہ پھوڑے کی طرف دھیرے سے کودا اور اس طرح اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا۔ پھر اندھیرے

میں اس نے صالح کو ڈھونڈا اور اس کے ساتھ بے چینی سے گھر کے اندر ہی ادھر ادھر گھومنے اور سامنے کی ہڑک پر آنے جانے والے ہر شخص کی آہٹ سننے لگا۔ اسے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے دروازے سے بھاگ کر دیکھا۔ وہی لوگ تھے جن کا خوف تھا۔ وہ لوگ بہت چچا چچا کر نعرے لگا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر طالب نے جلدی سے اپنے ہسپتال میں گویاں بھر کر اسے ہاتھ میں سنبھال لیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس ہسپتال سے ایسے حالات میں کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی۔

صالح کو بالکل چپ رہنے کا اشارہ کر کے اس نے سوچا اب کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ جب دیر تک کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو وہ دونوں اپنی خوابناک میں پلنگ کے اندر رضائی اور گدوں کے درمیان چھپ گئے اور سانس روک کر جلوس نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

لیکن جلوس ان کے گھر کے قریب آ کر رک گیا۔ نعروں کی آواز اب اور بھی بلند سنائی دے رہی تھی۔ انھیں اپنی سوت بہت قریب نظر آنے لگی۔ لیکن جہاں ان کے دلوں میں طرف سوت کا خوف پھایا ہوا تھا وہاں بلوائیوں کے گندے گندے نعرے سن کر فضا بھی آ رہا تھا۔ طالب بار بار رڑتے ہوئے سر ہٹنے کو تیار ہو جا تا لیکن صالح اسے روک لیتی۔

کچھ وقت اور گزرا، لیکن لگتا تھا ابھی اتنی ہی رات ہے۔ ان لوگوں نے پاس کے ایک گھر میں آگ لگا دی اور آگ بڑھ گئی۔ ان کے گھر جانے پر طالب اور صالح کا خوف کچھ کم ہوا، لیکن پڑوسی کا گھر جلنے سے انھیں راحت ملے، انھیں۔ ان کے ہوش حواس کچھ درست ہوئے تو انھیں لگا پڑوسی کے گھر کی قربانی سے انھیں نئی زندگی ملی ہے۔ صالح اس سے پٹ کر سسکتے لگی۔

آج کا پورا دن خوف کی اسی کیفیت میں گزرا تھا اور اب سامنے رات کھڑی تھی کہ جانے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایسے شب و روز کا سلسلہ نہ جانے کتنا طویل ہو گا؟ باہر سے تالا ڈالنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں محسوس کر رہے تھے۔ دن میں ٹی۔وی۔ خبروں میں انھوں نے دیکھا تھا کہ لوگ کلی جگہ ڈک لے کر



گئے، کسی گھریا دکان کا مال توڑ کر پورا سامان ٹرک میں بھر لیا اور جاتے جاتے گھریا دکان میں آگ لگا دی۔ بہت سوچنے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ زینے کے پہلے موڑ اور چھت کے درمیان جو دو چھتی ہے، جس میں گھر کا سارا ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور دوسرے غیر استعمالی سامان پڑے رہتے ہیں وہی سب سے محفوظ جگہ ہے، اس لئے وہیں چلنا چاہیے۔

بدقت تمام دو چھتی میں پہنچ کر انہوں نے دھندلے ماحول میں ممکن حد تک چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اس جس زدہ حصہ میں زینے کی طرف سے جانے والے راستے کے علاوہ ایک راستہ پیچھے بھی نکلتا تھا جو آگے جا کر گھر کی سب سے اندھیری کونٹھری میں پہنچتا تھا۔ اس کونٹھری تک پہنچنے کا ایک راستہ اور بھی تھا۔ اس دو چھتی کی بائیں دیوار گھر کی باہری دیوار تھی، اس میں ایک کھڑکی تھی جو دونوں سے بند تھی۔ اس کھڑکی میں ایک باریک سی جھری بھی تھی جس سے باہر کے حالات کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ دائیں طرف کی دیوار میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہ تھا۔

انہوں نے متعین کیا کہ اگر کوئی زینے کی طرف سے آئے گا تو اندھیری کونٹھری کی طرف بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی جائے گی اور اگر خدا نہ خواستہ کوئی اس کونٹھری کی طرف سے آگیا تو زینے کی طرف بھاگیں گے۔ پھر طالب کے ذہن میں ایک سوال اور گونجا، اگر دونوں طرف اس کا سر چکرا گیا کیوں کہ اس کے پاس امید اور دعا کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ ایک ہی طرف سے حملہ ہونے پر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ بچ ہی جائیں گے؟

لیکن اب اس نے بھاڑ کے دوسرے امکانات پر بھی غور کرنا شروع کیا۔ اسے سامنے کی کھڑکی کا خیال آیا کہ اس سے باہر کودنے پر ممکن ہے جان بچ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کھڑکی کے باہر کا جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ باہر تو بجلی کے ہائی وولٹیج ٹاوروں کا جال بکھا ہوا ہے۔ باہر کودنے پر تو اور بھی سخت موت و آہن گیر ہو جائے گی۔ بجلی کے شاخ کی موت بڑی تکلیف دہ...

اس سے اس سرزد دوسری حکمتوں پر چھپنے کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا لیکن سارے غور و فکر کے بعد اسے گھر کی سب سے محفوظ جگہ وہی محسوس ہوئی جہاں وہ تھے۔ دونوں دو چھتی میں ایک ایسے گوشے میں بیٹھ گئے جہاں سے ان کا خیال تھا کہ باہر کا ہر منظر دیکھ جائے گا اور گھر کے اندر کی بھی آنکھیں سنی جائیں گی۔ دونوں نے کچھ دیر تک بڑے غور سے ماحول کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی اور چھتی سے چھوٹی آہٹ پر کان دھرے اس کا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ دو چھتی میں پڑے ہوئے پرانے فرنیچر میں ایک لگی ہوئی تھی، کتنے ہوئے اور دیمکوں کا لقمہ بنتے ہوئے فرنیچر کی مہین مہین آوازوں نے شروع میں ان دونوں کو خوف زدہ کیا لیکن آہستہ آہستہ بات سمجھ میں آگئی اور ان آوازوں کا خوف ختم ہو گیا۔ کچھ دیر تک جب کوئی دوسری آواز نہ آئی تو انہوں نے کچھ اطمینان کی سانس لی۔ صاف سے طالب کے شے پر سر رکھ کر خود کو محفوظ سمجھ لیا۔ کچھ دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ طالب نے اسے غور سے دیکھا، پھر اس کی پیٹھ

تھپتھپانے لگا جیسے بچہ کو سنانے کے لئے تھپتھپاتے ہیں۔ لیکن طالب نے جیسے ہی اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا وہ گھبرا کر اٹھ گئی اور جلدی سے بھاگی۔  
کیا ہوا؟ کیا ہوا؟  
یہ کہہ کر وہ طالب سے لپٹ گئی۔ طالب نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔

”شش! چپ رہو۔ کچھ نہیں ہوا۔ کچھ نہیں ہوا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔“  
کچھ دیر بعد صاف پر پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ طالب کو کچھ دیر تک جب کوئی اچھل نہ سنا کی پڑی تو وہ ماضی کے کچھ واقعات کے بارے میں سوچنے لگا، اور سوچتے سوچتے کئی برس پیچھے پہنچ گیا۔

طالب کے پاپا کی طبیعت آج صبح سے ہی کچھ خراب تھی لیکن پھر بھی وہ کوئی دوا کھا کر دکان چلے گئے تھے۔ شام سے طالب کی بھی طبیعت خراب ہونے لگی تھی اور رات کے کھانے کے بعد سے اس کی ای کی بھی۔ رات سے یہ رونا بچتے بچتے تینوں شدید بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن پاپا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ جانے کیسا بخار تھا؟ پیسے کمزوری محسوس ہوئی، پھر بخار آیا، پھر منہ کا مزہ بہت خراب ہو گیا تھا، اس کے بعد پورے بدن میں ایب درد اور اتنی کمزوری محسوس ہونے لگی کہ کسی بھی طرح چین نہ ملتا تھا۔ بس ایسی حالت تھی جیسے جسم سے روح پھنسے ہی نکل چکی ہو، سین کی وجہ سے ابھی سانس گلے میں پھنسی ہوئی ہو۔ کم و بیش یہی کیفیت تینوں کی تھی لیکن طالب کے پاپا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی تشویش ناک تھی۔ ان کے منہ سے عجیب عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ابھی تک دلوٹ اسے معمولی بخار ہی سمجھ رہے تھے لیکن یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے کہ آج تک ایسی بیماری کبھی نہ دیکھی تھی۔ آخر کار خود اپنی خرابی طبیعت سے باوجود طالب پاپا کے دانتے سے ہر سے باہر نکلا۔ بس ابھی وہ تھوڑی سی دور کیا تھا کہ چہرہ کا سر پڑا، اسے ہوش تو تھا لیکن چوری طرح سے بکس۔ کچھ میں نہ آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔

اس نے روتے پکارا کوئی ہے؟ ”ولی ہے“ میں کوئی جواب نہ دیا۔ دروازہ تھکا سا مچھایا ہوا تھا۔ کچھ جگہ میں تھا۔ بھونکنے کی آوازیں بھی سنائے کو توڑنے لگی تھیں۔ بس آواز تو تھی۔ ”اب سے پاپا موت کی سانس کا دیں اور بھی گھبرانے لگتا۔“ اسے کوئی ہے اسے سے۔ ”آکر مجھے اٹھا لو“ لیکن طالب یوں ہی تنہا رہا، وہ دیکھا کہ پاپا بڑا رہا۔ بڑی دیر بعد اسے اپنے پاس کچھ کھسک کر سائی دی۔ کیا کوئی ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن جب آواز دیکھائی تو وہ گھٹانے والی بدبو کے بجائے اسے محسوس ہوا۔ یہ مٹی کا توڑ پھوٹا تھا۔ منہ اور غنودہ۔ لیکن چوہے نے اسے نظر انداز کیا۔ رات جیسے جیسے مٹی کی جڑی تھی۔ کئی حالت غزنی پاتی تھی۔ اس سے ”سہن“ کی محسوس ہوتی جا رہی تھی۔ مٹی تھا تھک پاؤں میں برف کی بولی سے نمودنی۔ مٹی میں کاہن بھی، درباری برفست میں سے پیتے تھے۔

اس نے دیکھا کہ انسانوں کا ایک طویل جھوم بے ترتیبی سے دوڑ رہا



ہے۔ سب ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور بار بار راستہ بھٹک رہے ہیں۔ آخر کار کچھ چوہے آکر ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ چوہے آگے آگے چلتے ہیں اور آدمی پیچھے پیچھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ کسی چیز کو سونگھتے ہیں اور کچھ پر تڑپے کے بعد مر جاتے ہیں اور انسان بھی انھیں کی تقلید کرتے ہیں۔

اس کے بعد طالب کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ گرد و پیش کی ہر آہٹ کو سننے کی کوشش کرتا ہے، کہیں سے کسی چے کے ٹوٹنے کی یا ہوا کے چھنے کی بھی آواز آتی ہے تو وہ چیخنے لگتا ہے۔ "کوئی ہے؟ کوئی ہے؟" تھوڑی دیر بعد اس کے چیخنے کے آواز دھیمی پڑنے لگتی ہے اور دیر دیر سے ختم ہو جاتی۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر ایک بار کاہوس اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگ کسی لیے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ بہت دشوار راستے ہیں، تیز دھوپ ہے، پھر مارش ہوتی ہے، برف باری ہوتی ہے، لیکن وہ لوگ کسی طرح گرتے پڑتے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ آخر کار ایک تیز طوفان آتا ہے اور انھیں زمین پر گرا جاتا ہے۔ طالب کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس کچھ درست ہوتے ہیں تو طالب ایک بار پھر اسی طرح پکارتا ہے:

"کوئی ہے؟ کوئی ہے؟" ارے کوئی ہے؟ بھی بولتے کیوں نہیں؟ کوئی ای سی ی ہے؟

ایک ایسی بولنس آکر رکتی ہے اور اس میں سے اٹھارہ بیس سال کا ایک بڑکا اترتا ہے، وہ بڑکا اس کے منہ میں رہنے والا کیشش تھا۔ طالب کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"کیا ہوا؟ طالب بھائی آپ یہاں کیسے پڑے ہوئے ہیں؟"

طالب اس کے چہرے سے پٹ پٹ گیا اور بولا۔

"کیشش میرے پاؤں بہت بیمار ہیں، انھیں کسی طرح بچالو، انھیں ہسپتال پہنچا دو، میں عمر بھر تمہارا احسان مانوں گا۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے طالب بھائی، یہ تو میرا فرض ہے۔"

ایسی بولنس میں بٹھا کر لوگ اسے ہسپتال پہنچا دیتے ہیں۔ کئی دن کی جدوجہد کے بعد طالب اور اس کی امی تویج حاتی میں لیٹیں اس کے پاؤں کا انتقال ہو جاتا ہے۔

کہیں بہت دور سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی تو طالب کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ پھر اسی دہشت ناک زمانے میں آگیا۔ صالح کی فنودگی اب ختم ہو چکی تھی۔ دونوں نے اس آواز کو غور سے سننے کی کوشش کی لیکن دوبارہ کوئی چیخ یا پکار نہ سنی دی۔ طالب نے سوچا خالوں نے نہ جانے کس ہتھیار سے مارا دگا۔

دوبارہ آواز تک نہ نکل سکی۔ تھوڑی دیر تک وہ آہٹ پر کان دھر رہے تھے لیکن جب کوئی آواز نہ سنی دی تو صالح نے چپکے سے کہا۔

"چلو آپا کے یہاں فون کر کے دیکھتے ہیں ممکن ہے اب بات ہو جائے۔"

ہو جائے۔

"اچھا، تم بیس رہو میں ابھی فون کر کے آتا ہوں۔"

"بیس، اکیسے نہ جاؤ۔ میں تمہارے چلوں گی، مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔"

طالب نے ہسپتال ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، تم بھی چلو۔"

فون مردو تھا۔ طالب نے جھنجھکیا اور ریسپور پکھلتے ہوئے کہا۔

"اب تو انیس اغڑاؤں میں، پھر بھی۔ جانے کیسے فون آئے گا۔"

ہوتے ہی فون ڈیڈ ہو جاتے ہیں۔ آپا کا فون تو صبح سے ہی ڈیڈ تھا اب ہمارا بھی

کیا۔ اللہ ہی جانے آپا اور ان کے گھر والے کس حال میں ہوں گے۔ اس محلے کی

حالت تو پرسوں ہی سے بہت بگڑی ہوئی ہے۔"

دونوں چپے چپے قدم رکھتے ہی سارے خانے میں دھپ آگے اور ٹیک

بار پچ اپنے خیالوں میں ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ بہت دور پر کسی مکان کے سامنے

کی سرخی مائل زردی اور گناڑا حادھواں نظر سامحوس ہو رہا تھا، لیکن وہ آگے نہیں

کوئی آواز ان تک نہ پہنچ رہی تھی۔ شاید ان کا دھم ہوا، اتنی دور سے اور دوا چھتی ہے سے

بھلا کیا دکھائی سنائی دے گا۔ دونوں بالکل ساکت ہو گئے۔ اب وہ سانسوں کی

آوازیں کے علاوہ کوئی بھی آواز نہیں کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب ولی آہٹ

سنائی پڑی تو وہ آہٹ دیر کے لیے سانس بھی لینا بھی روک دیتے تھے۔

طالب کے ذہن میں اس وقت نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ

کون سا لمحہ زندگی کا آخری لمحہ ٹھہرے، اس لئے وہ بار بار اپنے گہرے

احساس کرنے لگا۔ ذہن میں نہ جانے کون کون سے منظر پیش کرنے لگے، نہ

سے کسی کسی شخصیتوں کے چہرے ذہن کے پردے پر ابھرنے اور مٹنے لگتے۔

میں اپنا تک اس کا، بن ایک بار پھر ماضی کے ایک نقطے پر جا کر ٹھہر گیا۔

۲۶ جنوری ۲۰۰۳ء کو، دکان بند کرنے کی وجہ سے آج دوبارے

اٹھ تھا۔ صبح سے درختوں اور اونچی خانہ میں طواغیر اسی باتیں کر رہے تھے۔

امی اسے نامیہ دے کر کسی کام سے دور لے کرے میں چلی گئی تھیں۔ ابھی اس نے

چند ہی نوالے کھائے تھے کہ اچانک زمین ہلنے لگی۔ کسی نے پورے باورچی خانے کو

اس طرح میز جا کر دیا کہ طالب کو اس کی چھت میں جھسی گئے تھے۔ ساری تین گھنٹیں

ہو گئیں، لیکن کہیں چھت میں کوئی سوراخ سا تھا جس سے چوہے آ رہے تھے۔

ٹکڑا کر دروازے اور ایک کونے کے درمیان بڑھ چکا تھا۔ کہیں یہ بولی منہ جھونٹ

تو کہیں ان باتوں سے یقین تو نہ تھا، لیکن اس وقت اسے یہاں آیا کہ فون کا

قرآن پاک میں بھی ہے اس لیے جن کو ضرورت ہوتے ہوں گے قرآن کا خیال

آنے پر اسی گھبراہٹ میں اسے چند روز پہلے کی ایک بات یاد آئی۔ اس بار

نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

"اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قیامت کی جو نشانیاں بتائی ہیں، وہ

سارے آثار اب نمایاں ہیں۔ لوگو سنو اور دیکھو اور تو پہ کرنا بہت جلد قیامت آ

والی ہے۔"

تو کیا قیامت آگئی؟ زور سے گرنے کے باعث اس سرچرک اڑا تھا۔  
 مارے گھر میں عجیب طرح کی غراہٹ اور گھر گھراہٹ دوڑتی پھر رہی تھی۔ لیکن اس  
 نے جلد جلد اپنی زندگی کا ایک مختصر احتساب کر ڈالا۔ اس سرسری احتساب پر بھی  
 اتنا تو واضح ہو گیا تھا کہ میں نے قیامت کی مناسب تیاری نہیں کی ہے۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا  
 گیا، پھر لگا کہ ہزاروں بادل ایک ساتھ گز گزائے ہیں۔ اس کے منہ سے بہت تیز  
 چیخ نکلی لیکن اوپر سے ڈھیر سا رالمب آ کر اور اس کی چیخ دب گئی۔ اس کا حلق منی سے  
 بھر گیا لیکن کوشش کر کے اس نے آواز دینی شروع کی۔

”کوئی ہے؟ ارے بچاؤ۔ نکالو نکالو کوئی ہے؟“

لیکن اس کا گلا اس قدر خشک تھا اور چاروں طرف شور اس قدر تھا کہ  
 اس کی آواز اگر بلند بھی ہوئی تو کہیں باہر نہ پہنچی۔

اب وہ اینٹوں اور لوہے کی چھڑوں اور سینٹ چرنے کے ڈھیر میں دبا  
 پڑا تھا۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا لیکن کمر کے پاس کچھ کیفیت نہ تھی، جیسے وہ حصہ سن  
 ہو گیا ہو۔ ”کیا میری کمر لوٹ گئی ہے؟“ اس نے گھبرا کر اپنے پاؤں کو ہلانے کی  
 کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ لیکن اس کی ہانگوں پر تو منی اور اینٹوں کا لالہ انتہا بوجھ  
 تھا۔ چاروں طرف لمبی لمبی اور ہر طرف گونج، ہکار اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن  
 اس نے جب پیروں کو سینے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ انھیں ایک محدود  
 دائرے میں ہی دبا سکتا ہے، لمبے کے ڈھیر سے نکال نہیں سکتا۔ اسے اپنی ای کا  
 خیال آیا تو اس نے سر اوپر کی بے شمار آوازاں میں اپنی ای کی آواز کو پس منے  
 کی کوشش کی۔ کچھ دیر میں اسے لگا کہ وہ ان کی آواز کو پس نہ کیا ہے۔ آواز واضح نہ  
 تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہیں۔

”طالب، بیٹا طالب اتم کہاں ہو؟“

طالب نے خوش ہو کر ای کو جواب جواب دینے کی کوشش کی۔

”میں یہاں ہوں ای! امی میں یہاں ہوں باور ہی خانے میں۔“

’بیٹا میں تمہیں کیسے باہر نکالوں؟ باور ہی خانہ تو نظری نہیں۔“ ان  
 کی آواز جو ہلکی تو تھی مگر شور میں دب گئی۔

دیر تک وہ ایک دوسرے کی آواز سنتے رہے لیکن دھیرے دھیرے ای  
 ن آواز پست سے پست تر ہوتی چلی گئی۔ لوگوں کے چہرے کی آوازیں تو ابھی بھی ای  
 طرح آرہی تھیں لیکن مکانوں کے گرنے کی آوازیں اب بہت کم ہو گئی تھیں۔ اس  
 کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ یہاں سے نکلوں کس طرح اور ای وکس  
 طرح بچاؤں۔ کہیں وہ ختم

اس کے سامنے وہی راستے تھے: مدد کا انتظار کرنا اور ساتھ ہی ساتھ  
 مارے گھر سے نکلنے کی کوشش کرنا۔ لیکن مدد بھلا اس کا امکان ہی کتنا تھا۔ اپنا راستہ  
 نکالنے سے بہت دور گزرنے لگا لیکن انھیں تو دلی ہوئی تھیں۔ اگر وہ صحیح سلامت  
 ہیں تو ابھی نیکی کی شہادت کا کارنامہ۔

اس نے جان تو زبردور لگا دیا لیکن اس کی ہانگیں ٹس سے مس نہ

ہوئیں۔ اب کوئی آئے تو ہی میں بیچ سکوں گا۔ لیکن بھلا کون آئے گا؟ سب کو اپنی  
 اپنی فکر ہوگی۔ امی اور آپا کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کی حالت اور بھی بگڑتی جا  
 رہی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ جب روشنی بالکل زائل ہو گئی اور چاروں  
 طرف بے تحاشا اندھیرا چھا گیا تب اسے لگا کہ شاید اب رات ہے۔ اب بھلا رہائی  
 کہاں ممکن ہوگی؟ لمبے کا ڈھیر اسے ملک الموت کی طرح نظر آنے لگا۔ اوپر سے  
 اینٹیں اور گرد و مہر کے ڈھوکے لمبے کے ڈھیر ابھی بھی تھوڑے تھوڑے وقفے پر  
 گرتے اور ٹوٹتے پھر رہے تھے۔

”کوئی ہے؟ ارے بھائی کوئی ہے؟ میں یہاں ہوں! امی بھی یہیں  
 ہیں کہیں ہیں! سنتے کیوں نہیں لوگو؟ کوئی ہے؟ کوئی ہے؟“

لیکن اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔ لمبے سے نکلنے کی کوشش نے اس  
 کے ناخن اور اٹھیاں بولہاں کر دی تھیں۔ پرانے زخم ابھی خشک نہ ہوتے کہ زور  
 لگانے پر نئے زخم بن جاتے۔ اس کا بہت سارا خون۔ چکا تھا۔ اور شاید اندر بھی کہیں  
 جریان خون نہ ہو رہا ہو، کوئی اندرونی چوٹ بھی نہ ہو۔ رات ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی،  
 اور دھیرے دھیرے اس کا بدن بھی ٹھنڈا ہونا جا رہا تھا۔

کہیں دور سے سائرن کے بجنے اور ہارن کی آواز آئی، جیسے من کر  
 طالب نے ایک بار پھر پکارنے لگا۔

”ارے میں یہاں ہوں! کوئی ہے جو مجھے بچالے؟“

وہ لوٹ (اگر واقعی کوئی تھے) اور نکل گئے۔ امید کی جو ہلکی سی کرن  
 چمکی تھی وہ سیاہ پڑ گئی۔

آخر کار اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موت کو یاد کرنے لگا۔ اس  
 نے ان تمام مذہبی کتابوں کو یاد کرنے کی کوشش کی جن میں موت اور موت کے بعد  
 کے حالات کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام اہل یاد کیے اور  
 حساب لگا کر اپنے گناہوں اور نیکیوں کو توڑنے کی کوشش کی کہ کسی طرح شاید نیکیوں کا  
 پلڑا بھاری ہو جائے۔ لیکن اس کا کوئی امکان نہ رہا۔ یہ سب سوچتے سوچتے وہ  
 بے ہوش ہو جاتا اور اسے خبر ہی نہ ہوتی کہ نہ جانے کتنی دیر تک بے ہوش پڑے  
 رہنے کے بعد اسے کب ہوش آیا اور کب پھر وہ بے ہوش ہوا۔

ایک بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی اور رات  
 کے ختم ہونے کا احساس ہوا۔ ابھی وہ مسرت حال کا اندازہ کر رہی رہا تھا کہ اسے میں  
 اسے کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ طالب پھر چیخا۔

”کوئی ہے؟ بچاؤ مجھے بچالو نہ۔ کوئی ہے؟ ارے کوئی تو ہے!“

اس بار وہ اپنی جان بچانے والے رضا کار تھے اور انھوں نے طالب کی  
 کھنٹی کھنٹی پکار سن بھی لی اور فوراً اسے نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ دوسری بار ہوش  
 آنے پر طالب نے دیکھا کہ ان لوگوں میں کمیش بھی موجود ہے تو اسے اور بھی تشفی  
 ہو گئی کہ یہ لوگ لوٹ مار والے نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ اسوئیس اور ڈاکٹر بھی تھے۔  
 طالب نے ہوش میں آتے ہی اپنی امی کے بارے میں بتایا تو ان لوگوں نے ان کو



اور فوراً شروع کر دیا۔ طالب جب ایسویٹس میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس میں یکیش کی بھی زخمی حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ ایسویٹس کو روکے رکھا گیا کہ اگر طالب کی امی زخمی نکلیں تو سب کو ایک ساتھ ہسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن۔۔۔ طالب انھیں دیکھ کر تائب نہ لاسکا اور سہ ہوش ہو گیا۔ ان کے بدن پر کئی چوٹیں تھیں۔ اور روح خدا جانے کب نفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اسی وقت ایک ہار پھر ایک بھیڑ ان کے گھر سے کچھ دور پر گزری۔ وہ لوگ وہی پرانے نعرے لگا رہے تھے۔ آوازیں سننے ہی صالحہ طالب سے یوں پٹ گئی گویا طالب کی باہوں میں چھپ جائے گی تو کوئی اسے دیکھ نہ پائے گا۔ لیکن ان لوگوں نے طالب کے گھر کی طرف دھیان نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے۔ شور اور قدموں کی دھمک کے گذر جانے کے بعد طالب نے صالحہ کی طرف دیکھا۔ وہ سات بیٹے کی حاملہ تھی۔ یہ سوچتے ہی طالب کو دن کا وہ واقعہ یاد آ گیا جسے یاد کر کے اس کا جسم ہی نہیں روح تک لرز اٹھی۔ وہ عورت بھی تو سات بیٹے کی حاملہ۔ اس نے صالحہ کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا اور دل میں عہد کیا کہ کچھ ہونے کے پہلے وہ صالحہ کو خود گولی کا نشانہ۔۔۔

ان کا جسم کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیز بہت تیز آواز کے ساتھ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ دونوں گھبرا گئے کہ وہ کوئی بم تو نہیں۔ طالب ہستول سنبھال کر چاروں طرف کا جائزہ بنے لگا۔ اگر وہ بم نہیں تھا تو کوئی اور چیز، کوئی لونا ہو سکتا تو نہیں تھا جسے ٹبرے نے بھاگنے کی گھبراہٹ میں ادھر پھینک دیا ہو؟ لیکن گھر تو ہر طرف سے بند تھا۔ تو پھر، کہیں کسی نے اس شے کے لڑھکنے کی آوازیں تو نہیں لی؟ دونوں ایک لمحے کے لئے سن ہو گئے۔

صالحہ نے کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ شدید اندھیرے میں طالب کو کسی سائے کا احساس ہوا کہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف آرہا ہے۔ اب اس جگہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ شخص اگر آواز کا نشانہ لگا کر گولی چلائے گا تو ہم اس کی زد سے باہر رہیں گے۔ طالب نے ہاتھ سے نوثلے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا کہ کوئی ایسا سامان نہ ہو جس سے ٹکرانے سے پھر آواز ابھرے۔ دھیرے دھیرے وہ درجہ جستی سے اترے اور ریختے ریختے در کھٹک گئے۔ وہ سایہ بھی اسی بے فکری کے ساتھ ان کے گھر کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ جب وہ سایہ کچھ اور قریب آگیا تو لگا کہ وہ ایک نہیں دو تین لوگوں کا سایہ ہے۔ لیکن چال کی بے فکری کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ بلوائی تو تیز تیز دوڑتے ہیں یا چھپ کر حملہ کرتے ہیں۔ ایسی منترشتی والی چال۔۔۔ ایسے ماحول میں اتنی بے فکری سے کون محوم سکتا ہے۔؟

زور سے ڈکالنے کی آواز آئی اور وہ سائے ایک بھیٹس کی شکل میں بدل گئے۔ اس کا، ٹک شاہی مرچکا تھا یا وہ کہیں سے سرترزا کر بھاگی تھی۔ دونوں نے

کچھ اطمینان کی سانس لی، لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر کسی کے قدموں کی سی آواز سنائی دی، پھر کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر ہلکی ہلکی کھٹ۔ کھٹ۔ پھر وہی خاموشی۔ یہ کیا اسرار ہے؟ آواز کہاں سے آرہی ہے اور پھر غائب کیوں ہوئی جارہی ہے؟

کچھ دیر بعد کہیں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے ذرا سا مہانک کر دیکھا۔ آواز یکیش کے گھر کی طرف سے آئی تھی لیکن اتنی اندھیری رات میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ آواز وہیں سے آئی تھی یا کہیں اور سے۔ جب اس نے بہت آنکھیں میڑ کر دیکھا تو دکھائی سادیا کہ اس گھر سے دو تین سائے باہر نکلے ہیں۔ وہ انھیں غور سے دیکھتا رہا لیکن کچھ ہی لمحوں میں وہ سب کہیں اندھیرے میں گم ہو گئے۔ اندھیرے اور سائے میں فرق ہی کیا ہے؟ طالب نے سوچا، لیکن کوئی بات نہیں وہ تو اپنا ادوست ہے، اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اسی دم ٹی۔۔۔ دی۔ خبروں کا وہ منظر اسے یاد آ گیا جس میں ایک چھوٹے سے بچے نے، جو چنگ کے نیچے چھپ جانے سے بچ گیا تھا، پوپیس والوں کو بتایا کہ اس کی مٹی کو گولی "بھیا" نے ماری تھی۔

اچانک محسوس ہوا کہ قریب میں کہیں کچھ لوگ ہاتھیں کر رہے ہیں۔ طالب نے صالحہ سے سرگوشی کی: "سنی ہو؟ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ذرا کان لگاؤ۔" دونوں نے ان آوازوں کو غور سے سننے کی کوشش کی لیکن کوئی بات واضح نہ ہو سکی۔ کچھ دیر بعد ان لوگوں کے چلنے کی آوازیں سنائی پڑیں۔ وہ سانس روک کر ان آوازوں کو سننے لگے کہ وہ آوازیں گھر کے قریب آتی جارہی ہیں یا دور ہو رہی ہیں۔ اچانک طالب نے محسوس کیا کہ کوئی گھر کے پچھواڑے سے آرہا ہے۔ اس نے صالحہ کے کان میں کہا۔

"کوئی ہے؟"

صالحہ نے سرگوشی کی:

"لگتا ہے کئی آدمی ہیں اور دونوں طرف سے آرہے ہیں۔"

سائے کی گلی میں کئی طرح کی چال ڈھال نظر آتی تھی۔ کچھ سائے چار بیروں پر تھے اور کچھ دو بیروں پر۔ کچھ تو تین بیروں پر، یا دو پاؤں اور ایک انڈی (بندوٹی؟) کے سہارے چل رہے تھے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں، یہ انساں ہیں یا بھت پریت یا بدروحیں؟ اسے یاد آیا کہ اس کے بچپن میں اس کے بڑے ماموں کہتے تھے کہ اندھیری رات میں چڑھیں، راتقل لے کر قلعے کرنے نکلتی ہیں۔ طالب کے ہاتھ میں ہستول اب بھی تھا لیکن ایسے دہشت انگیز اور پر اسرار دشمن پر ہستول کیا کرتا۔ دونوں چپکے چپکے اوپر گئے۔ پھر انھوں نے پھیلی دیوار کی کھڑکی آہستہ سے کھولی اور باہر گلی کے پار پڑوسی کے گھر کے سائے چھاٹک لگا دی۔ گرتے گرتے ان دونوں نے سرگوشی میں کہا۔

"کوئی ہے۔ کوئی ہے۔" ☆☆☆



### کئی لمحے

تمہیں معلوم ہے جب بھی  
پرانے یار... بھلیوں کی  
یوں ہی بے سود باتوں میں  
کئی گفتگوں کی بے صرف اشتہات رائج ہو  
یا کرتے ہیں تو کتنا لطف آتا ہے

### زمین پہ آخری لمحے

اندھیرے دوڑتے ہیں رات کی ویران آنکھوں میں  
چراغوں کی جڑوں سے روشنی کا خون رستا ہے

سمندر کشتیوں میں  
چھید کرتی پھیلیوں سے بھر گئے آخر

صد اس قید گہ سے  
بھاگ جانے کی کڑی کوشش میں زخمی ہے

زمین فالج زدہ ہونٹوں کی چہنش سے  
نہر جانے کو شاید کہہ رہی ہے  
ہوا کی سانس نہو کر کھا رہی ہے

پرانے عمر میں نذرے ہیں  
اور ان میں سب کچھ اور ان کی  
باتوں کو جب دہرایا جاتا ہے  
تو کتنا لطف آتا ہے

تمہیں معلوم ہے کہاں طرح کے  
ان گنت لمحے جنہیں ہم یاد کرتے ہیں  
جنہیں ہم ڈھونڈتے ہیں  
زندگی کی ہر اداسی میں  
متقید ہیں گمزی کے عین مرکز میں  
رواں، ان سونیوں کی بے صلہ، بے کار حرکت میں

تمہیں معلوم ہے  
جب بھی مجھے ان کی ضرورت تھی  
تو میں نے وقت سے  
ان آخری ایام میں کتنی گزارش کی  
مجھے دے دو وہ سب لمحے  
کتاب ان کی ضرورت ہے، تو وہ مجھ سے یہی کہتا:

”کئی لمحے... بھلائی پر بندگی  
گمزیوں سے باہر ہیں۔ انہیں میں کیسے واپس دوں؟“

### ہر بار شکستہ بال و پر

یہ ایک شدید محبت کا  
انجام ہے یا..  
جو دور تلک اس واوی میں  
ذی روح مہیب اداسی میں  
افلاک کی جانب نظروں کا  
ہردن سندیر جیتے ہیں  
ہر بار شکستہ بال و پر  
ہم خون میں لتھڑے اونٹے ہیں

روز کوئی دیا جاتا ہوں  
روز آدمی کو آزماتا ہوں  
ہر گھڑی ٹوٹنے کا خطرہ ہے  
ہر گھڑی کچھ نہ کچھ بتاتا ہوں  
کیا ہے اسرار کیوں یہاں آخر  
روز آتا ہوں روز جاتا ہوں  
کچھ کسی سے میں پوچھتا کب ہوں  
کچھ کسی کو کہاں بتاتا ہوں  
کب کسی کو خیال رہتا ہے  
کب میں جاتا ہوں کب میں آتا ہوں  
خود مجھے بھی خبر نہیں کیا کیا  
خود ہی لگتا ہوں خود مٹاتا ہوں  
یاد رہتا نہیں سبق کچھ بھی  
روز بڑھتا ہوں بھول جاتا ہوں  
پھول کھتے نہیں ہیں ہانگوں میں  
پھول کاغذ پہ اب کھلاتا ہوں  
اپنی گردن میں موج آتی ہے  
اپنے سر کو اگر جھکاتا ہوں  
کیا عجب حال ہو گیا عالم  
کیا سنا تھا کیا سنا تھا ہوں

یہ سوچا نہیں ہے کدھر جائیں گے  
نہر سمیٹیں گے نذر جائیں گے  
میں یہ فضا اس آتی نہیں  
یہاں ہم رہیں گے تو مر جائیں گے  
ڈراتا بہت ہے یہ دریا ہمیں  
سو دریا میں اک دن اتر جائیں گے  
یہ دل رہتا ہے یہ دل ہمیں  
جدھر دل کہے گا ادھر جائیں گے  
جو روکیں گی رستہ کہیں منزلیں  
گھڑی دو گھڑی کو ٹھہر جائیں گے  
بہاروں نے مرجھا دیا ہے ہمیں  
تو کیا ہم خزاں میں سنور جائیں گے  
اسی خوف سے خند آتی نہیں  
کہ ہم خواب دیکھیں گے ڈر جائیں گے  
مٹ یہ گماں تھا ہمیں دیکھ کر  
کبھی راستے میں ٹھہر جائیں گے  
اسی خوش گمانی نے تنہا کیا  
جدھر جاؤں گا ہمسر جائیں گے  
یہ سوچا تھا کب شہر سے دشت میں  
مرے ساتھ دیوار دور جائیں گے  
کہاں دیر تک رات ٹھہری کوئی  
کسی طرح یہ دن نذر جائیں گے  
تغیر ہے لازم تو عالم کبھی  
ستارے زمیں پر بکھر جائیں گے

جلیس نجیب آبادی

میری اک عمر...

مری اک ٹم کا اندوختہ جس میں  
 نہ ٹھیاں ہیں نہ موتی ہیں  
 بھیں تم سنگ ریزے کہہ کے ٹھکرادو  
 قدم سے جس قدر پٹاریاں برسیں  
 انھیں تم راکھ سے تشبیہ دے دو۔ میر نے  
 "مردانہ" کے ہاتھ پہنچے ہیں  
 سے تمہاری نذر کا  
 من و ہمت میریں  
 دہرے سے ہوں۔ تمہیں دلی خواہشات ہیں  
 تمہارے ہاتھ ہیں سب  
 مے وں سے ہوں تاس قہقہے قہقہے  
 ہوں۔

یہ کتاب ہے

میرزا غلامی کی کتاب ہے

میرزا غلامی کی کتاب ہے

میرزا غلامی کی کتاب ہے

[illegible]



اور پھر اس پر اگر برقی بارش ہو جائے تب یہ منظر اور سہانا ہو جاتا ہے۔ اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے لٹکتی قلمروں، ریفوں، تاروں اور پھٹی کڑیوں کے خوابوں کی طرح مسکود کر دیتی ہیں۔

ابتدا میں اس پر فیہ حسن سے میں نے صرف مکتوظ ہوئی بلکہ مسکور بھی ہوئی  
متر ہویں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ کے شیشوں کی دیواروں سے برف گرتے  
رہے تو کچھ برف پاشش ملتا، عجیب تھی زندگی سے اور میں نے ان کھڑکے کھڑکے  
پیت جائے گی۔

مگر آخر کب تک؟ یہ سب کچھ بے حد خوبصورت ہونے کے باوجود، مگر  
میں مسلسل بندرجے رہتے ہیں کتنا کئی تھی وہ اب میری نہیں رہنے کا تھا۔ کب ختم  
ہوگی یہ سہی؟ کب ترین گے یہ استانی؟ کب ترادوں گے میرے ہاتھ؟ میں  
دن رات یہی سوچا کرتی۔

خدا مظلوم کو تھرا دے۔ یوں ہی گزرا گیا اور میں جب اس موسم کی تقریباً  
 عادی سی ہو چکی تھی کہ موسم کے نکات مدن پہلی بار درج حرارت سے متعلق کاغذات  
 غائب ہو گیا۔ اور یہاں کا موسم گرما آ گیا۔ پہلے ہی ایک اینڈ پر اریب نے نیا کرہ  
 آبشار دیکھے کا پروگرام دیا۔

[illegible]

اس آبنار کے ٹھارے کی جتنی صورتیں تھیں، ہم ان تمام سے محفوظ

میں اپنے ہاتھوں کے بارے میں ہمیشہ خوش فہم واقع ہوئی ہوں اور ان کے ہٹاؤ سنگھار کے انتظامات میں یوں مصروف رہتی ہوں جیسے شب عروسی کی لیکن سچائی جاتی ہے۔ چہرے سے زیادہ وقت اس کی دیکھیں وہاں پر صرف کرتی ہوں۔ ہاتھوں پر پابندی سے دن رات والے ہینڈ لوشن کی ماس، manicure، medicine اور نہ جانے کیا کیا اور ہر سب سے تیز میں ہاس کے رنگ پر جاتی ہوئی مافنی پائش انھیں حقیقتاً ایک تیار روپ دے دیتی ہے۔ لیکن سبب ہے کہ میرے ہاتھ آج بھی کنوارے ہیں جیسے ملائم اور خوبصورت ہیں۔

پھر کچھ یہ ہوا کہ ایک بھٹی رات کو رتی جیسے ب موسم شہر سے یہ دیکر  
میں ایک بہت بڑے اور ٹھنڈے ملک کے ایک غریب شہر نور انوا آ چکی۔

جیسے دستاویزوں سے نظرت اس روز ہوئی جب انھوں نے میری فتکاروں جیسی غزلیں اٹکیوں کو اپنے اندر یوں چھپا لیا جیسے سواریوں کو محلے کے غنڈوں اور بد معاشرہوں کی بری نظر سے چھپا دیا جاتا ہے۔

وہ دھبہ کی ایک نئی جہت شب بھی جب مہابی رنگ کے کوٹ سے ملے ہوئے مہابی رنگ کے دستاں پہناتے ہوئے ریب نے مجھ سے کہا۔

"یہاں کی سردی سے بچنے کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔۔۔ ورنہ  
خونٹہ لگ جاتی ہے۔"

میں صرف مسکرا دی اور کچھ کہے بغیر میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔  
ٹریمل سے ہا ہر ہلتے ہی راج سے پتھر سے کانوں پہنے۔ میں دونوں رخسار  
ماری مری سہلاتی اور تیرپا بھگتی ہونی جا رہا کٹاری میں بیٹھتی۔

کراچی جیسا شہر، جہاں اگر کبھی سردی آتی بھی ہے تو وہ بھی مانگے کی، کوئی۔۔۔ اچھا میں دو چار روز کی ٹھنڈ آتی ور کب چلی گئی، پتہ بھی نہ چلا۔ وہاں دستے تو بڑے بھی پڑے تھیں کاسٹیں بھی۔۔۔ چہتا تھا وہ یہاں۔۔۔ سے یہاں تک سب کچھ گرم چیزوں سے چھپا لینا ہی محنت کے لئے مقدم ہے۔

تور انٹو بے حد خوبصورت، مستقر انگھرا شہر ہے۔ مروجی کے موسم میں جہاں  
کی بج، جنگلی، کاناؤں کی چھتوں پر ہرف جھاڑیں لگنے سے زیادہ وسیع و عریض ہیں۔





اس روز چھٹی کے بعد حسب معمول راستے میں البرٹ جان (Albert John) مل گیا۔ وہ اپنے پوتے اور پوتی کو اسکول چھوڑنے اور لینے جا رہا تھا اور تقریباً روز ہی اس سے ہائی، ہو ہو جاتی تھی۔ کچھ تو ضعیفی، اور کچھ گھٹیا کے سبب وہ چھڑی کی مدد سے چلتا تھا۔ مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا اس ضعیفی میں وہ یہ زحمت اٹھاتا ہے۔ میں نے کئی بار یہ پیش کش کی کہ میں یہ کام کر سکتی ہوں کیوں کہ ہم دونوں کے آنے اور جانے کے اوقات یکساں تھے۔ مگر وہ ہر بار میری درخواست بڑی خندہ پیشانی سے رد کر دیتا۔ باتوں باتوں میں اس بات کا علم تو ہو ہی چکا تھا کہ اس کا بیٹا بہودونوں کام کرتے ہیں اور علی الصبح ہی گھر سے نکل جاتے ہیں۔ لہذا اس کام کی ذمہ داری البرٹ پر تھی۔ البرٹ نے پوچھا۔ "دیکھ ایڈ کیسا گندہ را؟"

میں نے بتایا کہ ہم آبشار پر گئے تھے اور پھر میں نے کل کا سارا احوال اسے بڑے خوش سے کہہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جوانی کا ہر اتوار وہیں گزرتا تھا۔ پھر بہت دیر تک ہم قدرت کے اس شاہکار پر ہی گفتگو اور تبصرہ کرتے رہے۔ البرٹ بھی ہماری ہلڈنگ میں، بلکہ اسی منزل پر رہتا تھا جس پر ہم تھے۔ اس لئے اس سے روز ہی کبھی لٹ، کبھی عمارت کے اندرونی فنٹ پاتھ اور کبھی گھر کے سامنے پارک میں اس سے ملاقات ہو جاتی۔ اس لئے باتیں کرتے وقت میں بہت مطمئن رہتی تھی کہ وہ میری باتیں کسی سے متائے گا نہیں، البتہ سونپا سے بات کرتے وقت تمہارا احتیاط رہتا پڑتا تھا۔ وہ اپنی طرف کی تھی نہ۔ میں ڈرتی کہ وہ ضرور میرے دل کی بات سزخاروق سے جا کر کہہ دے گی اور پھر وہ مجھے اپنی بتائی ہوئی شریعت کی ترازو میں تولنے بیٹھ جائیں گی۔ سزخاروق سے ملاقات بھی ایک دلچسپ حادثہ تھی۔

میں یوں ہی ایک روز کہیں جا رہی تھی کہ مخالف سمت سے ایک قدرے فربہ جسم خاتون تیز تیز آتی نظر آئیں۔ پینٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس، سر پر اسکارف۔ میں نے بھی اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھ لیا۔ نزدیک آنے پر انھوں نے "ہیلو" کہا۔ میں نے بھی "ہائی" کر دی۔ ہم رک کر بات کرنے لگے۔ وہ ہانگ (jogging) کے لئے نکل گئیں اور مجھے پاس کی سہولتی دکان (convenience store) سے اٹل روٹی لینی تھی۔ وہ محوم کر میرے رخ پر چل پڑیں۔ مجھے ان کی شخصیت اچھی لگی کہ جب سے یہاں آئی تھی بیشتر کورے اور روکے چہرے ہی دیکھ رہی تھی۔ آج جو یہ سانولا، نمکین اور اپنا اپنا سا چہرہ نظر آیا تو عمر میں فرق کے باوجود دل ان کی جانب تھمپنے لگا اور دوستی بڑھانے کی نیت سے میں نے ان سے باتیں شروع کر دیں۔

"خیرت ہے، یہاں تمہیں اپنی طرف کے لوگ کم نظر آئے؟ یہاں تو بہت بڑی کمیٹی ہے ہماری۔"

"اچھا؟ کس طرف؟"

"اسی صوبے میں۔ خاص طور سے مسی ساگا (Mississauga) میں،

جہاں ہم ہیں۔ یہاں تو بہت پاکستانی ہندوستانی آباد ہیں۔"

"واقعی؟ یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے۔"

"ہاں، اور اب تو یہاں دیندار اور شریعت پر عمل کرنے والے بھی لوگ بہت آگئے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا اسکارف برابر کیا۔ ہاتھ اوپر کرنے سے فی شرٹ قدرے اوپر اٹھ گئی، جس سے ان کی سانولی سلونی کمر کا کچھ حصہ نکل گیا تھا۔ میں مسکرا دی۔ انھیں شاید اس کا احساس نہ تھا، یا ہوا تھا تو پروا نہ کی، وہ کہتی رہیں۔ "کوئی شرعی مسئلہ ہو جائے تو فیصلہ بھی وہی سناتے ہیں۔"

"فیصلہ سناتے ہیں" یعنی یہاں بھی جرگہ قائم کر لیا ہے؟" میرے اندر کا کانٹا سا کھٹکا۔

"میں کبھی نہیں، جرگہ کیا مطلب؟" ان کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ نئی نئی دوستی تھی اور میں دوستی کو قائم رکھنے کی خواہش مند بھی تھی لہذا میں نے بات بدل دی اور اپنی ہلڈنگ اور پارٹمنٹ کا نمبر بتاتے ہوئے بولی۔ "کبھی آئیے نہ میرے گھر۔"

"ہاں تم بھی آنا۔" انھوں نے خوش دلی سے کہا۔ غالباً انھیں بھی میرا دم خیمت مل رہا تھا۔ "تمہاری ہلڈنگ کے سامنے جو ٹاؤن ہاؤسز ہیں نہ! انھی میں سے ایک میں رہتی ہوں میں ۴۱۹ نمبر میں۔"

"اوہ، پھر تو بہت قریب ہیں آپ۔ ضرور آؤں گی۔"

"آپ نہیں، تم۔"

میں کھل کر ہنسی۔ "تم بھی آنا۔"

پھر ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اور اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ کچھ دنوں بعد میں نے ان کو سونپا سے بھی ملوا دیا۔

وہ جو کوئی 'سچا' شاعر کہہ گیا ہے کہ چار دن کی چاندنی، پھر اندھیری رات ہے۔ وہ شاید ہمارے لئے ہی کہہ گیا تھا۔ ابھی میں گرمی کی چاندنی کے اس موسم سے جی بھر کے لطف اندوز بھی نہ ہوئی تھی کہ دو دن ہلکی ہلکی سردی شروع ہو گئی اور پھر اسی اندھیری رات کا راج تھا۔

ایک بار پھر برف باری، برفانی طوفان اور بریلی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے اریب سے صاف کہہ دیا کہ میں اس موسم میں ہرگز اسکول نہ جاؤں گی۔

"ارے پاگل ہو کیا؟ ایک مہینے کی بات رہ گئی ہے، اس کے بعد تمہیں سرٹیکلیٹ مل جائے گا جو آئندہ کام آسکتا ہے۔ کچھ نہیں بگاڑتی یہ برف۔ دیکھو ہر کام معمول کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ تم کل ہی جا کر اچھے snow boots خرچہ لو۔"

میں مان گئی۔ میں اس لئے بھی مان گئی کہ گھر میں اکیسے پڑے رہنے سے پھر وہی بوریت شروع ہو جائے گی۔ مجھے اپنا word perfect کا کورس بہت دلچسپ اور معلوماتی لگ رہا تھا۔ لہذا یہ سلسلہ جاری رکھا۔

اگلے ہی ہفتے کی بات ہے۔ رات بھر کی برف باری کے بعد میں نے صبح اٹھ کر جو نظارہ دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ مسی ساگا کے تمام لوگ آج صرف برف



صاف کریں گے۔ تمام گھروں میں بسنے والے اپنے اپنے گھروں کے سامنے سے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق، یعنی کوئی پھاؤڑے سے اور کوئی بجلی کے موٹر کی مدد سے، جتنی جان سے صرف اسی کام میں لگا ہوا تھا کہ دروازے کے سامنے اور راہداری سے پرست ہٹائی جائے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں اپارٹمنٹ میں ہوں اور ہمارے یہاں پیڑمرداری انتظامیہ کی ہوتی ہے۔

کافی کامگاہتھ میں لینے سے قبل، میں نے اپنا سب سے ناپسندیدہ کام یعنی استانے پہنے۔ آج میں نے چڑی دستانوں کو ترجیح دی۔ ان میں دو خوبیاں صاف تھیں، ایک تو یہ کہ وہ گرم زیادہ محسوس ہوتے تھے، دوسرے ہاتھوں پر بالکل فٹ آجاتے تھے۔ اس طرح کافی کامگاہتھ میرے لئے آسان ہو جاتا تھا جو اسکول جاتے وقت ہمیشہ ہی میرے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہی، بہرٹ بھی مفت کی جانب جاتا ہوا نظر آیا حسب معمول پھڑی، اور بچوں کے ساتھ۔ بیواہائی کے بعد دونوں نے موسم کا رونا رویا۔ یہاں کے کچھ مقامی لوگ بھی ہمیں سے برف دیکھتے رہنے کے، وجود اس موسم میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ باہر کریم ٹوٹ فٹ پاتھ پر چنے گئے جہاں کی برف صاف نہیں کی گئی تھی۔ میں نے (پنی زباں میں) پھونک پھونک کر قدم رکھنا شروع کیا کہ اگر درابھی بعد قدم پڑا تو پاؤں پھسلنے کے سونی صدا مکانات ہوتے ہیں اور اس چوٹ میں کسی بھی ہڈی کا چٹک جانا یا ٹوٹ جانا ممکن ہے۔ کیوں کہ چنے کے بعد برف بھر بھری نہیں رہتی سخت ہو کر شیشے کی مانند ہو جاتی ہے۔ چھٹی کے وقت ایک بار پھر البہرٹ کا سامنا ہوا۔ تھوڑے فاصلے پر وہ مجھے اسکول کی جانب جاتا ہوا نظر آیا۔ ان چار ٹھنوں میں مزید برف، داری ہو چکی تھی اور اس کے پاؤں بار بار برف میں دھنسنے رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ اچانک ہی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور دھڑام سے گرنے کے ساتھ ہی تھوڑا سا آگے پھسل بھی گیا۔ دو چار لوگ جو وہاں سے گزر رہے تھے، انھوں نے اپنا چلنا پھل جاری رکھا جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اس کا ایک پاؤں پورا برف میں دھنسا ہوا تھا اور وہ اسے نکالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور اسے سہارا دے کر بمشکل کھڑا کیا۔ چند قدم یوں ہی میرا ہاتھ پکڑے پکڑے چلتے رہنے کے بعد اس نے تشکر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”ٹھنکس سارہ! اگر تم نہ آتیں تو میں ابھی جانے کب تک یوں ہی پڑا رہتا۔“

میں ابھی کچھ کہتی کہ ایک بجلی سی آواز کے ساتھ کوئی گاڑی ہمارے نزدیک کررک گئی۔

”ہائے کیا ہو سارہ؟“

یہ سوچا تھی اور اس کے ساتھ کی سیٹ پر مسز فاروق۔ دونوں پریشانی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

”مسز البہرٹ پھسل کر گر گئے۔“ میں نے کہا۔

سوچا پریشانی سے بولی۔ ”اوہ! کو جلدی سے جھیلی سیٹ پر بندھ دو۔ مگر تک چھوڑ آتے ہیں۔“

”نہیں سیکس۔ میں چلا جاؤں گا۔“ البہرٹ نے جواب دیا۔

”No way“ سوچا نے کہا اور گاڑی سے باہر آگئی۔ ”سب تکلف کر رہے ہیں، جو قطعاً یہاں کا رواج نہیں۔“ یہی تھی ہم کافی پینے کے سوا میں تھے اور سردی کی طرف جارہے تھے۔ کمال ہے، آپ تو، چپے چپے۔“

پھر دوسری جانب سے اس نے بھی انھیں سہارا دیا۔ وہ پریشانی سے بولے۔ ”بچے نکلتے دسے ہیں، ہر۔ ان کو بھی تو پیارے۔“

”سب گاڑی میں تو بیٹھیں۔ بچوں کو سارہ دے کر آتی ہے۔“

انھیں ان کے گھرا تار کر اور بچوں کو کچھ کھانا دے کر میں ان دونوں کے ہمراہ اپنے گھر آگئی۔ کچھ دیر تک ہماری گفتگو کا موضوع البہرٹ اور اس کا گرنا ہی رہا۔

”اچھا کافی تو پلاؤ۔“ سوچا نے کہا۔

”بے شک۔“ میں نے کہا اور کچھ دیر بعد کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچا نے کہا۔

”یہ کھدیاں، سالی سی ریڈ لگاتی ہیں یہاں، اپنے in laws کی۔ بے چارے کو ساتھ رکھا ہے تو اب اس کی جتنی سخت ڈیوٹی بھی لگا رہی ہے۔ ٹھنڈی ہے، ہونہ۔“

”یہ نہ ہو سوچا۔ ہمارے پاکستان اور تمہارے ہندوستان میں بھی تو اب یہی سب ہو رہا ہے کہ نہیں؟“ میں دوپہر تیار اور۔“

مگر وہ اپنی ہی کہے گئی۔ ”ارے بچ گیا بڑھا۔ بچا لیا تو نے ورنہ ہڈی دڑی ٹوٹ جاتی آج اس کی، یا پھر سردی سے مر گیا ہوتا۔“

”واہ یہ بات ہوئی۔ میرا بڑا ہی ہونے کے ناتے اس کا حق تھا کہ میں کہ میں اس کی مدد کروں اور۔“

لیکن ایک بار پھر میری بات کاٹ کر وہ دل کھول کر کہی۔

”ارے پاگل! یہ کون سی کھالے کر بیٹھ گئی ہے تو اس زمانے میں حق اور فرض کی۔ مان کیوں نہیں لیتی کہ تو نے ہی اسے بچایا ہے۔ اچھا مسز فاروق آپ بتائیں؟“ اچانک وہ مسز فاروق سے مخاطب ہو گئی اور تائید کی توقع رکھنے والے کے انداز میں ان سے پوچھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مسز فاروق؟“

”ارے امیں تو اس بات کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ سارہ بچ گئی۔“

”سارہ بچ گئی؟“ حیرت کے اظہار کے وقت سوچا کا چہرہ ہمیشہ ہی ہونٹوں جیسا ہو جاتا تھا۔

”ہاں بھئی، اب دیکھو نہ سارہ نے نہ صرف اس نامحرم کو چھو بلکہ سہارا بھی دیا۔ جس کی ہمارے یہاں اجازت نہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ اس نے دستا نہ پہنے ہوئے تھے اور البہرٹ نے بھی۔ نہیں تو اللہ پناہ میں رکھے، کبیرہ۔“ ☆☆☆

اس میں صرف ایک مساوات درج کی۔ (اب یہ اور بات ہے کہ ہائیک کی کتاب  
موتوں تک بالا فروخت (Best Seller) رہی، اور آج بھی مل جاتی ہے)۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آج سے ساٹھ برس پہلے ہماری زبان میں سائنسی بیان و مباحث کی صلاحیت تھی، اور ایسے لوگ تھے، جو اس صلاحیت کو بروئے کار لا سکتے تھے، تو یہ آج بھی ممکن ہے۔ شرط صرف محنت، خود اعتمادی، اور زبان اردو سے محبت پیدا کرنے کی ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے (اور اردو کے "دوست صاحبان" اسے اکثر اٹھاتے بھی ہیں) کہ اردو میں سائنسی کتاب لکھنے یا ترجمہ کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اسے پڑھنے کا کون؟ یہ سوال صرف غلط بحث پیدا کرتا ہے۔ پڑھنے والا نہ ہو گا تو کتاب کہاں سے آئے گی، یا کتاب نہ ہوگی تو پڑھنے والا کہاں سے آئے گا؟ یہ دہی پہلے مرغی ہوئی کہ انڈا؟ دنیا سوال ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پڑھنے والے ہیں (ورنہ "سائنس" دس سال کیا، دس مہینے بھی نہ چلتا، اور "سائنس" کے سوا بھی اردو میں سائنسی رسالے ہیں، مثلاً "سائنس کی دنیا"، جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ دوسری بات یہ کہ کتاب ہوگی تو پڑھنے والے بھی مجھ ہو جائیں گے۔ تیسری بات یہ کہ پڑھنے والے نہ بھی ہوں، لیکن زبان تو ہے۔ ممکن ہے کل کو پڑھنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا تو زبان کو متمول بنانا کی ہمارا فرض نہیں ہے؟ محمد حسین آزاد نے سوا سو برس پہلے کہا تھا کہ اردو میں کچھ نہیں، صرف عشقیہ شاعری ہے۔ یہ بات تب بھی غلط تھی اور اب بھی غلط ہے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو میں سائنسی رسالے پڑھنے والے نہیں ہیں وہ ایک پرانے جھوٹ کو بچ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان سے برأت کا اظہار کرنا چاہیے۔

ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہئے کہ اردو میں سائنسی ادب کی روایت کوئی دوسو برس پرانی ہے۔ دہلی میں دہلی کالج اور ماسٹر رام چندر اور دوسروں نے سائنسی کتب کے تراجم کئے اور خود بھی کتابیں لکھیں۔ ودھ میں ملا عبد الرحیم نے گورکھپور میں، اور پھر کولکٹہ میں، مشرق کے کئی دیگر مترجمین نے، عظیم گندھ اور پٹنہ میں، پھر انجمن ترقی اردو نے اور ممبئی آباد اور دہلی میں، جامعہ عثمانیہ نے حیدر آباد میں، ہمارے سائنسی ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کئے۔ کام کی رفتار گھنٹی بڑھتی رہی، لیکن کام ہوتا رہا۔ یہ محض بد نصیبی ہے کہ ہم نے خود کو یقین دلایا ہے کہ اردو میں سائنسی ادب نہیں ہو سکتا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اردو میں نئے علوم کی تمام اصطلاحوں کے متبادل الفاظ نہیں ہیں، اس لئے ہمیں اردو میں سائنس لکھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ لہذا اب ایک منٹ رگ کر اس بات پر غور کر لیتے ہیں کہ سائنس ور دیگر علوم پر ہمارے لکھنے والوں کو آسان سے اصطلاحیں کیوں بھج نہیں پہنچتیں؟

(۱) ظاہر ہے کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم کتابیں اور لغات و فرہنگیں نہیں دیکھتے۔ بہت سے علوم کی فرہنگیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ چاہے بہت اعلیٰ درجے کی نہ ہوں، کامل و نامل نہ ہوں لیکن موجود تو ہیں۔ ان سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ پھر کتنی ہی عمومی لغات ہیں، اختصاصی علوم کی رہنما کتابیں ہیں جن سے

ہم اصطلاحات حاصل کر سکتے ہیں، یا ان کی مدد سے اصطلاحات بنا سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی - اردو لغت، کلیم الدین احمد کی انگریزی - اردو لغت، شان الحق حقی کی آکسفورڈ انگریزی - اردو لغت، درجیم کی انگریزی - فارسی فرہنگ ہمارے سامنے ہیں۔ کلیم الدین احمد کی لغت تو مہنگی ہے، لیکن بقیہ لغات ہزار روپے کے اندر کی ہیں۔ مولوی صاحب کی لغت تو انجمن ترقی اردو - چھاپی ہے اور باسانی مل جائے گی۔ دوسری لغات تھوڑی سی کوشش سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان میں سب اصطلاحیں نہ ملیں گی، اور کوئی ضروری نہیں کہ جو اصطلاحیں، ان میں مل جائیں آپ ان سے مطمئن بھی ہو جائیں۔ لیکن رہنمائی کا کام تو یہ لغات بیشک انجام دے سکتے ہیں۔

(۲) دوسری وجہ، اور شاید سب سے بڑی وجہ، یہ ہے کہ ہماری زبان میں اشتقاقی لفظ کا اصول نہیں ہے، اور عطف سے لفظ بنانے کی بھی روایت نے ہمارے یہاں کم فروغ پایا۔ یہ دوسری بات افسوس ناک ہے، کیونکہ لفظ سے لفظ بنانے کا رواج پرانی اردو میں بہت تھا، اور غیر رسمی اردو میں اب بھی ایک حد تک ہے، لیکن تحریری اردو میں بے بہت کم ہے۔

اشتقاق لفظ کے اصول سے میری مراد یہ ہے کہ ہر لفظ کی ایک "اصل" یعنی Root اور "صل" سے بہت سے لفظ نکلتے ہوں، جیسے کہ جز سے شاخیں پھوٹی ہیں۔ (عربی میں "جز" کو "اصل" کہتے ہیں۔ Root Word کو عربی میں "دادہ" کہتے ہیں اور یہ ہمیشہ عربی ہوتا ہے۔ ہم بھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔) عربی مادوں کے بذات خود معنی ہوتے ہیں، ورنہ ان سے جو لفظ بنتے ہیں وہ بھی باسعی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مادہ ہے ت-ث-س۔ اس سے کم سے کم حسب ذیل الفاظ بنتے ہیں۔

حسن، بمعنی اچھا، اچھائی، نیکی، اتا۔ احسانت سے مراد حسن۔  
 حسانت، بواحد مونث، فحسی، جمع، فحسات، واحد، فحسہ۔  
 حساں، اسم مبالغہ، حسانت، احسان کی تصغیر، فحس۔  
 حُسن، بمعنی اچھائی، خوبصورتی، جماعت، فحس، اتا بیٹ، حسیت  
 جمع، محاسن، اسم تفصیل، احسن۔

حسن، یعنی اچھا / نیک کام کرنا، اہم فاعل، ورا تہ مفعول۔  
 حسن، جمع، تحسین، تحسینات، تحسینات۔  
 تحسین، یعنی خوبصورت بنانا کرنا، علیہ و اسہ علی، ورا تہ مفعول۔  
 تحسین، تحسین۔

انتخابات کیلئے چھپا کھینچا، خرید و بیعہ کی مجلس اور غیر منقولہ



یقیناً یا عقیدہ جو اس کے دل میں جا گزریں ہے اور وہ زمین جس پر اس کے پاؤں  
 نکلے ہوئے ہیں، ان کے خلاف وہ کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اس کی وابستگی فن سے ہے  
 لیکن معروضی صورت حال بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ حق و انصاف کے لئے  
 اپنی حکومت سے اختلاف بھی کر سکتا ہے مگر ریاست سے نہیں۔ سارتر کے سلسلے میں  
 ڈیکال کا جسدِ بھی زیادہ دیر کی بات نہیں۔ تھوڑی سی بجلی پیدا کرنے کے لئے بہت  
 بڑی انسانی آبادی کے اخلاقی اور حکومتی سرپرستی میں فسادات کے خلاف ارون دھتی رائے  
 کا احتجاج بھی تارہ واقعہ ہے۔ جب کلیم الدین احمد نے کہا تھا کہ لوب اور سماج ایک  
 دوسرے کا رد عمل ہیں تو دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ سماجی تحریک کے امکان کو رد نہیں کیا  
 جاسکتا لیکن لوب اور سماج کا مکمل ردِ طرفِ عمل ہے۔ یہ ان کی مثبت فکر میں ایک اضافہ  
 تھا۔ رن انھوں نے ترقی پسند ادبی فکر کے اصول و ندرت کے رد میں کہا تھا کہ کیا کسی  
 پہاڑی چشمے کو دیکھ کر کسی ادیب کو خیال آیا کہ اس سے پن بجلی بھی پیدا کی جاسکتی ہے؟  
 اب ادب کے بنیادی محرکات پر چند باتیں ہو جائیں۔ پہلے ان کی

فہرستِ ملاحظہ ہو:

- ۱۔ خود اظہاری کی خواہش  
۲۔ لوگوں میں اور ان کے افعال میں دلچسپی  
۳۔ حقیقت کی ایک دنیا (جس میں ہم رہتے ہیں) اور تصور کی دوسری دنیا (جو ہمارے وجود میں ہے) سے دلچسپی  
۴۔ ہیئت سے قربت کا احساس بلکہ محبت  
ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم جو سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اس پر لوگوں کو اعتبار ہے اس لئے کہ ادب مصنف کے افکار و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ ہم لوگوں (مردوں و عورتوں) سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی زندگیوں، ان کی نیوٹوں، ان کے جذبات، ان کے تعلقات سے ہمیں ایک گونہ لگاؤ ہے۔ گویا وہ انسان کی زندگی اور عمل کا ڈراما ہے۔ ہمیں شوق ہے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے اور تصور کیا ہے اس کے بارے میں لوگوں کو بتائیں۔ اور اگر اس میں جمالیاتی تحریر شامل ہو تو ہمیں خاص تسکین ہوتی ہے کہ ہم نے حسن کا اظہار کیا۔ اس طرح آرٹ ایک فارم بن جاتا ہے۔ انسان جسے معاشرتی حیوان بھی کہا گیا ہے اظہار کو تخلیقی قوت کی آمیزش کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ حقیقت اور تصور کا تناسب کتنا ہو یہ بھی جاننے کی خواہش اور یہ کہ دل میں ہے وہ ابلاغ کے ذرائع بھی تلاش کرتا ہے کہ اس کے ساتھی شعور کا دوسرے لوگوں کو بھی اندازہ ہو۔ پھر ادب کی ہیکٹوں سے بھی اس کو دلچسپی ہوتی ہے۔ دوسروں کے افکار، احساسات، تجربات، مشاہدات، تصورات کا حاصل جان کر ہمیں خوشی ہوتی ہے۔

ادب کے محرکات پر گفتگو میں ایک مشکل یہ آس پڑتی ہے۔ اس میں مختلف علوم کی حدیں درجہ ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ فلسفہ، حیاتیات، تاریخ، معاشیات کے بعض نظریات یہاں صرف ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں پھر بھی فن کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ مثلاً اشعار میں محض شخصیت کا اظہار نہیں، شخصیت سے گریز کا نام بھی ہے۔ بشری محسوس یا انسانی احساس، استعداد بھی اس کے اسالیب میں شامل ہیں۔ قرأت و تہذیب اور مصنف کی عدم موجودگی نے

گل کھلا رہی ہے۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ادب دراصل فنون کا شعبہ ہے علوم کا نہیں۔ اسے عقلی (rationalize) سے ہٹکچر یا وہ نہ نہیں ہوتا۔

اب ایک دوسرے نکتے کی طرف توجہ کیجئے۔ شاعری اور دیگر ادب میں ادب کو اپنی صنفی حیثیت منوانے اور تنقید کو ان کا جزواں عمل ثابت کرنے میں وقت لگا لیکن ایک بار قائم ہو جانے کے بعد اس کو سند بننے میں دیر نہیں لگی۔ ستم دیکھئے کہ ہمارے اہل عمل کے مقصود کی وضاحت کرنے والے افلاطون نے اپنی ریاست میں شاعری کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی۔ اس سے کہا کہ شاعر کی چیز بنانا ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے، جذبات کو برہنہ کرتی ہے، اس سے ضرر رساں ہے۔ لیکن اس کے براہ راست شاگرد ارسطو نے شاعری کے لائق عمل پر پوری کتاب لکھی جس میں اس نے "نقل" کی بات کو حقیقت سے دوری کے بجائے نزدیکی کا عمل قرار دیا۔ اس نے نقطہ یہ بھی ثابت کیا کہ شاعر کی کو اہلی فلسفیانہ امر کہا، جذبات کے حقیقہ (کنکریٹس) کی بات کی، حقائق کا قصہ چھینا، کردار کا ذکر کیا اور ادب میں انبساط انگیزی کے پہلو کی نشان دہی کی۔

بہت آگے چل کر مگر مذہبی شریعتوں نے پہلے فنون لطیفہ پر شاعر اور فلسفی ہو رہے تھے اور فطرت کے تصور کو ادب میں شان پیدا کرنے کا سبب بنایا۔ لہذا بحسب نے ادب میں ترفع کی بات کی۔ اس نے خیال کی عظمت، جذبہ کی شدت، صنعتوں کے استعمال، اسلوب کی متانت، اور الفاظ کی منطقی ترتیب کی اہمیت کو واضح کیا۔

یہاں ہم جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ محرک ہے تحریک نہیں۔ اسے انگریزی کے لفظ mobilization سے ترجمہ کیا گیا ہے اور اس کا پہلا حصہ mobilize یا تہائی ہے۔ اب غور کیجئے تو سہاٹی تحریک بالکل سادہ کی بات معلوم ہوتی ہے کہ ادبی تحریروں مثلاً شاعری، فلسفہ، ڈراما وغیرہ میں یہ جو ہر ہے کہ وہ معاشرے کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن ادب یہ کام براہ راست نہیں کر سکتا، وہاں سخت گیر سیاسی محاشروں کی بات آ رہی ہے کہ وہاں ادیب کو حکومت کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ مہذب قوموں کی تعریف کیا بیان کی گئی ہے وہ معاشرہ مہذب ہے جہاں ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے متصادم نہ ہو۔

ابھی وہ لمحہ بھی قوموں کی زندگی میں آتا ہے جب تمام افراد قوم کو یکساں ہو کر کہنا بلکہ عطا ہوتا ہے کہ ہم ایک قوم ہیں اور اپنی سرحدوں کا دفاع کرتے رہتے ہیں۔ ملکوں کے لئے یہ تاریک وقت ہوتا ہے۔ ایسے میں بہت سے انفرادی خیال اور ذاتی مفادات ترک کرتے ہوتے ہیں۔ اس وقت تو بس ایک ہی سنسنی ہے کہ ہمارے پاس کے بچے جوڑ میں سے دو ٹھکنے۔ پاپ۔ آج کی صورت حال میں ہم بحیثیت قوم اسی مسئلے سے دوچار ہیں۔ عالمی دہشت گردی کے ہمارے خلاف ہمیں بلکہ اس کے خلاف کارروائی میں عطا تو دن بھی کر رہے ہیں۔ اس کے اثرات ہمارے معاشرتی و سماجی و معاشی کے گوشوں پر پڑ رہے ہیں اس لئے ہم انہیں دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے ادب پر اس کا انوکھا بھی بہت دور کی بات ہو رہی ہے۔



ہم کو بھائی نہ آئی  
رسم وفا

نہ سہی

اطوار جفا

تم نے بھی کہاں سیکھے؟

جو کچھ بھی کیا تم نے

اچھا ہی کیا ہوگا

انجام کی پروا

ہم کو بھی کہاں تھی

چلو یوں ہی سہی

ہم ہی میں

نہ تھی

ضبطِ مسم کی عادت

شکوہ ہی کیا

لیکن اپنوں سے کیا

غیروں سے مگر

پردہ ہی رہا

ہم نے جسیں رسوا نہ کیا

شجر ہے خطر آئیں پرندے  
گلوں کے رنگ دہلائیں پرندے  
دبا کر چونچ میں رنگین کرئیں  
ہماری جھت پہ آئیں پرندے  
تصور کے میں جب دانے بکھیروں  
جسیں لنگھوں کے پھنس جائیں پرندے  
نظر صیاد کی پڑنے سے پہلے  
مرے دل میں اتر جائیں پرندے  
کبھی پھل پھول سے شاخوں پہ لگیں  
کبھی آنچل سے لہرائیں پرندے  
ہنچے میں جو آئے شاہزادی  
ہوا میں گھل کے اڑ جائیں پرندے  
بوقتِ شام جب سورج کہے تو  
پلٹ کر اپنے گھر جائیں پرندے

ٹھکانا ڈھونڈھوں کوئی آسمان سے اونچا  
مکان بناؤں کوئی اس مکان سے اونچا

مرا ہر ایک عمل جبر کے حصار میں ہے  
پرندہ اڑ نہ سکے آسمان سے اونچا

بیدشت وہ ہے جہاں شیر خود مچان پہ ہے  
بنا مچان کوئی اس مچان سے اونچا

کبھی تو آئے گی اپنے لہو میں طغیانی  
کبھی تو ہوگا یہ پانی نشان سے اونچا

سفر تو میرا زمیں پر ہی تھا مگر مجھی  
اک آسمان ملا اک آسمان سے اونچا

غضب کی دھند ہے طاری زمیں پر  
گماں حاوی ہوا شاید یقیں پر

پا ہے ہر طرف شور قیامت  
کوئی بیٹھا ہے چپ عرش بریں پر

میں سرتاپا اندھیرا ہی اندھیرا  
کروں کیا تبصرہ ماہ ہمیں پر

بنا ہوں دین و دنیا میں کچھ ایسا  
کہیں پر سر ہے میرا دھڑ کہیں پر

حرم ہو بت کدہ یا قصر شاہی  
ہر اک کا ہاتھ اٹھتا ہے ہمیں پر

خزاں کی ایک دوپہر  
(اسعد ہادیونی کی رحلت پر)

سید محمد اشرف

(اسعد ہادیونی کی یاد میں)

میں سو رہا تھا یہاں یہاں - چن  
یہاں سے یہاں سے یہاں سے یہاں سے  
اب یہاں سے یہاں سے یہاں سے  
سہ پہر یہاں سے یہاں سے یہاں سے  
فلک سے تیرے شمع میں قیوم ہے اپنا  
چرخِ شمع جو بجھ جائے تو تیری ہر چیز  
بس ایک داغِ جدائی نہیں یہاں سے  
وگرنہ موجِ ملاقات دھوگئی ہر چیز  
میں سو رہا تھا تو ہر چیز جیسے جاگتی تھی  
میں جاگتا ہوں تو لگتا ہے سوگئی ہر چیز  
بکھر رہی ہے سرگردشِ غبارِ یہاں  
کہ ہمارے غیب میں دنیا پر دگنی ہر چیز  
نہ جانے پردہ ہستی کے اس طرف کیا ہے  
کہ آنکھ موند کے دیدار کو گئی ہر چیز

خزاں کی ایک دوپہر  
ہوا کے ظلم سہرے کے  
خامشی سے ڈھل گئی  
رفاقوں کی شام  
دیکھتے ہی دیکھتے  
دھوپ کی رات میں بدل گئی  
دھوپ کی حدوں کو پار کرنے والی جاں  
پیاس کے نواح میں  
دھونڈتی رہی اماں  
سوت کے سیاہ سرد ہاتھ نے  
شاہراہِ زیست پہ دوڑتی کلیں کرتی  
سانڈلی پہچانزدی  
مطابِ خیمہ پہنچ کر اکھاڑ دی  
کسی کا خیمہ خواب کا  
ہزاروں چاک سے اٹا  
نچا نچا، پھٹا پھٹا  
یونگی پڑا رہا  
رفو کی فکر میں  
بدن کی بازی ہار دی  
جان سی عزیز شے بھی وار دی



## کلیم کاشانی، عہد شاہجہانی کا طور معنی

کلیم کاشانی نے سری نگر کشمیر میں انتقال کیا (۱۶۵۱) اور وہ اسی قبرستان میں دفن ہے جہاں بعد میں غنی کا شیریں آسودہ خواب ہوئے۔ کلیم کی موت پر غنی نے تاریخ  
کی تاریخ

### طور معنی اور روشن از کلیم

کلیم کی زندگی کے آخری ایام بیماری کے باعث تکلیف میں گزرے لیکن دربار شاہجہانی سے اس کی وابستگی اور پھر ملک اشترانی میں اس کی شان بڑی تھی۔ جب  
شاہزادہ فرم نے شہاب الدین محمد شاہجہاں کے نام سے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو بعد چندے اسے سلطان ترکی کا مراسلہ ملا کہ آپ شاہ ہند ہیں، پھر شاہجہاں لقب کیوں  
اختیار کیا ہے؟ دنیا میں سات، قالم ہیں اور آپ صرف ایک کے بادشاہ ہیں۔ اللہ کے نزدیک عبدالرحمن، عبداللہ، پسندیدہ ترین نام ہیں۔ ان میں سے کوئی اختیار کیجئے اور لقب  
"شاہجہاں" ترک کر دیجئے۔

اس خط کا کسی سے کچھ جواب نہ دین پڑا تھا اور یہ فیصلہ ہونے ہی کو تھا کہ لقب "شاہجہاں" ترک کر دیا جائے اور سلطان روم کو مناسب جواب بھیج دیا جائے کہ کلیم کاشانی  
نے عرض گزرائی کہ "جہاں" اور "ہند" کے اہم ادایک ہی ہیں (۵۹) لہذا شاہ ہند کے لئے لقب "شاہجہاں" پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔ پھر اس نے مطلع پڑھا۔

ہند و جہاں زردے ہر دو چوں برابر است      ہر دو خطاب شاہجہاں زان مقرر است

سار اور ہار ملزک اٹھا۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ سلطان روم کو یہی جواب بھجوا دیں اور کلیم کو اشرافیوں میں گواہ دیا۔

ایک بار شاہجہاں کو بخیر آگیا اور صحت میں دیر لگی۔ اس موقع پر کلیم نے رہائی کی جو اپنے مضمون کی قدرت اور نکتہ دہی کے باعث فارسی ادب کا شاہکار ہے۔ رہائی کا  
مضمون یہ تھا کہ اہل زمین نے بادشاہ کی صحت کے لئے اتنی دعائیں بارگاہ خداوندی میں بھیجیں کہ نجوم سے پایاں اکٹھا ہو گیا اور کسی کو آسمان سے باہر نکلنے کا راستہ نہ رہا۔ یہی باعث  
ہے کہ حضرت عیسیٰ (جو اسلامی عقیدے کے اعتبار سے فلک چہارم پر تشریف فرما ہیں) بادشاہ کی مسجائی کے لئے زمین پر اتر نہ سکے۔

روزے کہ تن شاہجہاں از حب یافت      آن نیست کہ عیسیٰ پہلا جس بخت یافت

ی رفت دعائے مستعش بسکہ بخرغ      ی خواست کہ آہ جز میں را نہ یافت

## کہتی ہے خلق خدا

لوں کی بھی غلطیاں شامل ہیں (چنانچہ اردو پاکستان کی "قومی رہاں" ہونے کے باوجود آج تک سرکاری اور تعلیمی زبان نہ بن سکی۔

ہندوستان میں کچھ اور بھی مسائل ہیں جو یہاں سے زیادہ شدید ہیں۔ کئی نغمیں جو "ادب" "علائے مذہب" نے صدیوں سے پھیلا رکھی ہیں، ان کا مکمل تدارک آج تک نہ ہو سکا۔ مثلاً قربانی کا مسئلہ اور اس میں "گائے کشی" کی روایت جو صرف "ہندوستانی" ہے۔ حضرت ابراہیم نے تو "دب" "دب" کیا تھا، اس کی بنا پر اسے تک رہتی تو برداشت کر لیا جاتی۔ "گائے" کو کس تصویر کی سراوی جانے لگی، جب کہ ہندوستان میں اسے "ماتا" کا درجہ حاصل تھا اور حاصل ہے۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ گائے اور بیل کے اس ملک پر کتنے حسانات ہیں۔ رراعت کے علاوہ چارے ملک کی ٹرانسپورٹ بیل کے گاندھوں پر ہی اور جی حد تک آج بھی ہے۔ بیل گائے سے جنم لیتا ہے۔ پھر یہ کسی مذہبی حوالے سے اگر دو مقدس سمجھی گئی تو یہ ہوا۔ ہم تو کڑی کی خدمت بھی نہیں بھولتے اور اسے مارے نہیں دیتے۔ علامہ اقبال نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔

قرآن کریم اس اعتبار سے جو اسی مظلوم حیوان ہے کہ جسے دنیا میں کوئی اور کام نہیں ملتا، اس کے ترجمہ اور تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے حالانکہ یہ نہایت نازک اور محتاط انداز رہی ہے (ماخوذ از "روزگار فقیر" از فقیر محمد الدین)۔

مفسرین نے بے شمار جنس پھیل لی ہیں اور محمود غزنوی جیسے سونے چاندی کے ادبی مند آور لکھنے والے کو "تنگ" کا لقب دے کر اپنا پیرا بنادیا۔ ایسی کئی یادایاں، اس نظروں کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان میں اہل طریقت نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اہل شریعت نے دے سکے، انھوں نے تو آپس ہی میں نظریں پھا کر دیں۔ تفصیل میں چاؤں گا تو بات طویل ہو جائے گی۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہم اکبر الہ آبادی کے طریقہ کار پر عمل کریں۔ آپ بھی اپنے رسالے کو "ادبی" ہی رہنے دیں تو اچھا ہوگا۔ آپ "جدیدیت" کے طہر دار ہیں اور جدیدیت کی جو تعریف آپ کرتے ہیں اس سے کڑی تر تعریف آپ سے متعلق ہونے لگے ہیں کیوں کہ آپ کا ادب سچی کہیں ہے۔ لیکن ترقی پسندی بحیثیت ایک طرز فکر "فلا" نہیں ہے۔ اس میں غریبوں کو اپنانے کے بڑے امکانات ہیں۔ آپ کی کشادہ دلی کا اندازہ اس سے ہو کر آپ سے میری "۱۲ ٹیاں" اور غریبوں کے بعض اشعار جوں کے توں شائع کر دیئے۔ وہ بہت واضح بھی تھے اور کشادہ بھی۔ ظاہر ہے کہ آپ ہاشمور قاد ہیں۔ میر نے تو کھیلے الفاظ میں کھراؤ اور لیا تھا مگر آپ نے میر کا مطالعہ بھی نہایت وسعت نظر کے ساتھ کیا ہے۔ میر اشعر تو اسی "گائے کشی" کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنوبییشیا کی بیگیاں ہے اور ہماری تاریخ کا تقاضا ہے۔ جس نے تصوف اور دیانت کو یک جا کر دیا ہے۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔

ذکیہ مشہدی واحد مرسلہ نگار ہیں جنھوں نے آپ کی مخالفت کی۔ وہ "فس" کا مطالعہ باضابطہ کرتی ہیں، اس لئے راجندر یادو کے انداز فکر اور ان کی وسعت نظر سے باخبر ہیں۔ ذکیہ صاحبہ کے نقطہ نظر سے یادو صاحب "سیکولر" صحافی اور ادیب ہیں۔ ان سے

● ذکیہ مشہدی اور پرکاش چندر کے خطوط کے سوا یہ خطا میں آپ کے مضمون کی تعریف کی گئی تھی اس لئے سب سے پہلے میں نے اسے پڑھا۔ یہ مضمون پڑھتے ہوئے مجھے شدت سے اپنی بے بساختی کا احساس بھی ہوا۔ کاش میں "مس" کے یڈیٹر راجندر یادو کا ادارہ بھی پڑھ سکتا۔ بہتر ہوتا کہ آپ ان کا ادارہ یہ بھی چھاپ دیتے۔ مگر آپ تو اپنے بھلائے ہوئے ہیں (اپنے مضمون میں) کہ اس ادارہ سے کو "نسٹا" بھی آپ سے بڑی مشکل سے گوارا کیا۔ آپ جیسے صاحب علم آدمی تو اسے غصے میں لکھ کر حیرت بھی سونی اور (معاف کیجئے) انھوں بھی ہوا۔ سچ ہے مذہب کا معادہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ اسی لئے اکبر۔ آہادی نے کہا تھا۔

مذہبی بحث میں سننے کی ہی نہیں

فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

ایسے میں نہیں جانتا کہ یادو جی نے براہ راست مذہبی مسائل چھیڑے یا تہذیبی حوالے سے مذہبی باتیں کیں۔ آپ کے مضمون سے "شریعت" کے کچھ متاثر نکات کا سراغ مل رہا ہے۔ ایسے مسائل تو مسلمانوں میں بھی بہت "تنتے" ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں کئی فرقے ہیں اور سب کی فرقہ پرستی مختلف بھی ہے۔ اسی کے زیر اثر شرعی مسائل میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

مثالیں بے شمار ہیں۔ اجماع ہادی سے ہم اپنا جائزہ لیں تو خود فرستہ ہو کر رہ جائیں گے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی۔ ایک بے ضرر تہذیبی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ہماری "مذہبی فہم" کا اندازہ ہو جائے گا اور اس شخصیات کا بھی جو بلاشبہ معتمد خیر ہیں اور ہم میں آن بھی موجود ہیں۔ ہم اپنی خواتین کو (ہندوؤں کے لباس) سازشی میں دیکھ کر ہنس کر رہتے ہیں مگر خود دعوتی نہیں داندھتے۔ شادیوں میں سروس کی ہندوستانی روایت قدیم ترین ہے مگر اب گریز کیا جانے لگا ہے (اس میں دو بندی اور بریلوی اختلافات ہارن ہو گئے ہیں)۔ تہذیبی شعور سے لباس اور رسوم کی قبولیت غیر فطری نہیں ہے اور موسموں کے تہوار بھی مشترک طور پر منائے جاسکتے ہیں مگر ہماری تنگ نظری ان میں بھی حائل ہو جاتی ہے۔

آپ نے اپنے جوابی مضمون میں جو تاریخی حوالے دیئے ہیں وہ بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ایسا دلت کوئی دوسرا ہے تو ہم ہمارا من ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے پردہ بڑے لڑے یہ دلت کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں ہمارے بچے تہذیب سمجھنے والوں سے کوٹھے پر جاتے تھے۔ اسی حوالے سے یہاں سندھ میں شیخ یار (جدید سندھی ادب کا مجدد آفریں شاعر) نے ایک تاریخی بات بیان دہرا دی کہ اردو تہذیب "طوائفوں کی تہذیب" ہے تو یہی خواہ ہو گئے اور مرتے دم تک اسے معاف نہیں کیا گیا۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے مسائل بہت سے اچھے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی کے بعد یہاں سندھی کی حق تلفی ہونے لگی۔ یعنی ایوب خاں کے دور میں جب اسے دفاتر اور مدارس میں ممنوع کر دیا گیا تو تمام سندھی اردو کے خلاف ہو گئے اور پھر یہ نظرت ہونے کے دور حکومت میں ہور شدید ہو گئی حتیٰ کہ سانی فسادات ہو گئے (اس میں اردو بولنے

اختلاف رائے کیا جاسکتا ہے مگر انہیں اپنے دائرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اختلافات پر سمجیدگی سے سوچ کر نہایت محبت کے ساتھ جواب دینا چاہئے۔ یاد صاحب اور س کے رسالے "ہنس" کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ بہر حال آپ جیسے ہاشم اور صاحب علم دانشور سے ہمیں یہی توقعات ہیں۔

میں پرکاش چندر کے خیالات سے بھی اتفاق کرتا ہوں، انہوں نے رابن جیری کے مضمون کی مخالفت کی ہے۔ اگر یہ سلسلہ درست ہے تو "شب خون" میں اردو صحافت کا بھی تاریخی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں بھی نئی ایسے تاریخی مقامات آج میں سے کر شایہ ہمارا قلم سرتھڑے لے سکے۔ اس لئے ہمت کی ہے کہ اب کو دس بیڑے لایا جائے اور "شب خون" بھی "ترقی پسند اس" کا نمونہ بن جائے گا اور اس پر بھی وہی اثرات پائے جائیں گے جو ترقی پسندوں پر عموماً پڑتے ہیں۔ خدا ہے آپ میرا خط شائع فرما دیں یہ میں آپ "خواتین کی" "بقیہ" داشت کریں گے اس کا مجھے یقین ہے۔

کچھ ملاحظاں اضافی طور پر لکھ رہا ہوں، انہیں مراسلے کا حصہ سمجھ کر پڑھ لیں اور اس سے ہمیں قشاح بھی لڑیں تاکہ جن خطرات میں پہنچیں ہوں گے ان کے بھی مطالعے میں آجائیں۔ یہ لکھتے ہوئے "دیکھے ہوئے خیالات" ہیں جو ہمارے ذہنوں میں بھی گردش کرتے ہیں۔ یہی ہی کچھ باتیں اور ان کی نظر میں بھی آجائیں تو کیا مصداق ہے۔ "تکو تو دوستی سے۔" یہ بھی تو "یہ مسودہ مذاکرہ" کہتے ہیں مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ج

مقصود اس سے قطع تعلق نہیں ہمیں

دشوار تو ضرور ہے جو کھل تو ہمیں ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرار شہرم ہم ابن جہل ہی سہی، پوجہل تو نہیں

(۱۰۸)

عام تھے، ہاکمال تھے، اہل کتاب تھے ہمیں جس سے تو اپنی حقیقت میں کھل ہی دے۔ نہ کہ میں ہم خود جواب دے

(انکشاف)

ہر لفظ میں پوشیدہ ہے خود اپنا جواز ایمان میں نہ کیوں علم ہو شرط قبول اقرا سے، نبوت کا بھی حرف آغاز

(حرف اول)

یہ ہم خود دانت میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(زادین نگار)

حرف و رنگ صوت سب انھما کے آئلب ہیں ماورائے ذہن، ہر تمثیل، ہر کردار میں آدمی کی آرزو ہے، آدمی کے خواب ہیں

(ما بعد الطبیعیات)

سورج کا یہ انداز گواہی تو نہیں ہے آئینہ دکھاتا ہے اجالا مجھے پیہم سایہ مرے اندر کی سیاہی تو نہیں ہے

(دوسرا رویہ)

ہر فتح میں نہاں کوئی گہری شکست ہے سنی سے بے نیاز، یہ لفظوں کا احترام ہر بت حکم کے دل میں کوئی بت پرست ہے

(عمر طلب)

الفاظ کے بت گر ہیں اور معنی کے قاتل لوگ ہیں سوچتا ہوں میں تو اکثر بول افسق ہے کتاب صاحبان علم بھی دراصل جاہل لوگ ہیں

(جہل)

کروں انکار یا اقرار لیکن یہ حقیقت ہے وہ خالق ہی کسی میرا، میں بندہ ہی کسی اس کا مجھے اس کی ضرورت ہے، اسے میری ضرورت ہے

(ضرورت)

ہم میں وہ شوق عبادت اب کہاں ہر محلے میں پھلتے ہیں مگر سے حد سے اونکاں، تیر مکان

(روح تغیر)

قرآن، خدا، رسول ہے سب کی زبان پر ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز جیسے گلی ہو نام کی گھنٹی مکان پر

(سائش)

بشر نے ڈالی ہے کیا عظمت بشر کی طرح نکھار دی ہے یہی منت ہر ایسی کہ آدمی نہ ہو قربان، جانور کی طرح

(احترام آدمیت)

ہر آہنگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(رویت ہمارا)

شب خون





یادو نے مذہب اسلام کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں کہا تھا۔ ان کا رویہ سخن مسلمانوں، اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب، اور اردو زبان اور رسم الخط کی طرف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے دعوت دی گئی تو میں نے ان کو جواب دینا مناسب اور ضروری سمجھا۔ مذہب سے سروکاری الحال نہ انھیں ہے اور نہ مجھے۔ اور میں خود کو مذہب اسلام کا مبلغ یا محافظ بھی نہیں سمجھتا۔ راجندر یادو کا جواب دینا اس لئے ضروری تھا اور ہے کہ ان کا لہجہ، استدلال، اور زبان، عقیدوں ہی اس ذہنیت کی غلازی کر رہے تھے جو اس ملک میں ایک مخصوص سیاسی اور مذہبی فکر سے مختص تھی جاتی ہے اور اس ملک کے کروڑوں ہندو مسلمان اس ذہنیت کو مطعون کرتے ہیں۔ میں یہاں تنہا نہیں ہوں۔

بہت سے مسلمانوں میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری ہے۔ حمایت علی شاعر نے ساری اور دھوتی کی عجب دلیل دی ہے جو ان کی عدم واقفیت کا پردہ بھر چاک کرتی ہے۔ مشرقی یورپی سے لے کر بنگال اور آسام تک، اور پھر بنگلہ دیش میں، لا تعداد مسلمان دھوتی پہنتے ہیں۔ ذبیحہ گاؤ کا معاملہ بیچ میں لا کر وہ بات کو اور بھی غیر منطقی بنارہے ہیں۔ پاکستان کا حال میں نہیں جانتا، لیکن اس ملک میں بہت سے لوگ ذبیحہ گاؤ کے مخالف ہیں اور وہ سب ہندو نہیں ہیں۔ اور بہت سے لوگ ذبیحہ گاؤ کے موافق ہیں، اور ان میں بھی سب مسلمان نہیں ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس (سنی یا شیعہ) عالم نے ذبیحہ گاؤ کو اسلام کی شرط ٹھہرایا ہے۔ میں بہت سے پابند شرع مسلمانوں کو جانتا ہوں جو گوشت نہیں کھاتے۔ بہت سے صوفیوں کی درگاہوں کے گاؤں میں ذبیحہ گاؤ، بلکہ بعض جگہ تو کسی بھی قسم کے ذبیحے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح اشادی میں سمرے پر پابندی میں نے یہاں نہیں دیکھی، باہر کا حال مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ چھوٹی سوئی باتیں ہیں، اس سے بنیادی مسائل نہ مستحکم کرنا چاہئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کون سے مسلمان شرفا یا ملا وغیرہ کے بچے "تہذیب" سمجھنے طوائفوں کے کوٹھے پر جاتے تھے، یا کسی بزرگ نے یہ بات کہی ہے۔ یہ ضرور سنا گیا ہے کہ ایک زمانے میں کچھ لوگ کہتے تھے اگر علم کلیسیا سیکھنا ہے تو طوائفوں سے سیکھو۔ لیکن اس سے یہ مطلب کہاں اور کیوں DO ہے کہ اردو تہذیب "طوائفوں کی تہذیب" ہے، اور یہ مطلب کیسے نکلا ہے کہ اردو تہذیب مسلمانوں کی تہذیب ہے؟ مجھے نہیں معلوم کہ شیخ یار مرحوم نے کس سیاق و سباق میں اپنی بات کہی تھی۔ میں اس کو بہت محترم سمجھتا ہوں، لیکن اس کی ہر بات کو درست نہیں سمجھتا۔ محمود غزنوی کو "بت شکن" کہا کسی منسکر "بدعت" نہیں ہے، اس میں تفسیر قرآن کو سمجھنا انانہا کی دانش مندی ہے؟

راہن جٹری کا مضمون جدید ہندوستان میں خواندگی کی حرکیات، خبر اور اخبار رسائی کے مسائل، انگریزی کے بالمقابل ہندی پریس، اور ہندی تہذیب پر سیاسی حمایت کی اثر اندازی کے بارے میں تھا۔ مگر اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو ہندی صحافت کے یہ طبقے کو اچھی روشنی میں پیش نہیں کرتیں، تو ان باتوں کی تردید جی برحقان کی ضرورت ہے، اور وہی صورت کو بھی فرقہ دارانہ سیاسی کھیل کھیلنے کا بھرم ٹھہرانے سے یہ مقصد ملے ہوگا۔ یہ استدلال تو اندرا گاندھی کا تھا کہ تہذیب ہندوستان میں رشوت خوری اور مصلحتوں پر نہیں چلے، یہ تو ساری، یا میں پھیلے ہوئی ہیں۔ صحافت، خبر رسائی، خواندگی،

یہ تہذیبی اور ادبی مسائل ہیں، انھیں غیر ادبی یا سیاسی مسائل وہی کہہ سکتا ہے جسے سیاست اور ادب کی خبر نہ ہو۔ خاص کر اب تو انڈیا ورڈ سٹیڈ کے بعد ہم یہ کہہ ہی نہیں سکتے کہ جو چیزیں ادب کے "گرد و پیش" میں ہیں ان کا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔ ویسے میں اپنی معلومات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ آزاد ہندوستان کی اردو صحافت پر فرقہ داریت کا دھبہ نہیں لگ سکتا۔ شاید یہ اپنے اپنے نقطہ نظر کی بات ہے۔

اب رہے جناب راشد جمال فاروقی تو ان کی سادگی کچھ حمایت علی شاعر سے کم نہیں کہ ان کے خیال میں جن مراسلوں نگاروں نے راجندر یادو سے اتفاق نہیں کیا ہے وہ ہندی نہیں پڑھتے، یا "نہیں" اور راجندر یادو کے صرف نام سے واقف ہیں۔ راشد جمال فاروقی صاحب اگر مراسلوں کو ذرا توجہ سے پڑھتے تو ایسی بات نہ کہتے۔ یہ بھی پر لطف بات رہی کہ جو راجندر یادو سے اختلاف کرے وہ محسوس الرحمن فاروقی کی "دعائی" کر رہا ہے لیکن جو راجندر یادو سے حقیق ہو، وہ یادو کا عداوت نہیں، بلکہ "خدا لکھی" کہہ رہا ہے۔ سبحان اللہ۔

محسوس الرحمن فاروقی

● جناب شاہد اختر علیا کی تحریر شمارہ ۲۷ میں دیکھی۔ میں نے تو نعمان شوق اور عالم خورشید پر کھلے اسے تاثرات رقم کئے تھے مگر جناب شاہد اختر نے ان کی طرف اشارہ ہی میں مد سے تجاوز کیا، تعجب ہے۔ عالم خورشید میرے دوست ہیں اور نعمان شوق بھی مجھے اچھے جانتے ہیں۔ لیکن ادب میں کوئی چیز کھل نہیں ہوتی۔ میں اردو شاعری کا کوئی ملحق یا قاضی نہیں اور نہ کسی مقتدرہ کا امیر ہوں جو "ہندوستان پاکستان میں مگر حق کی طرح، گئے والی شاعری پر خامہ فرسائی" کروں۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ شاہد اختر نے نہ مگر متادیکھا ہے اور نہ اس کے بارے میں اس کو کچھ علم ہے۔ پھر یہ کہ عالم خورشید اور نعمان شوق کو جناب شاہد اختر نے "غریب کی جورو" کیوں کر سمجھا؟

راجندر یادو کے مضمون کا جواب فاروقی نے بہت مناسب اور عالمانہ دیا ہے۔ دوسرا کوئی اس قدر برجستہ اور بیاپے نکتہ بہ نکتہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ بس ذرا لہجہ ترش ہو گیا جس کی طرف دیکھ شہیدی نے اشارہ کیا ہے۔ اور یہ کیا بات ہے کہ ذکیہ شہیدی کے بارے میں سید سراج الدین کا یہ حمد پھپھا ہے کہ ذکیہ شہیدی کون ہیں؟ سید سراج الدین صاحب جدید افسانے سے کچھ زیادہ شغف شاید نہیں رکھتے۔

بھاکل پور

● اگست کا شمارہ اس لحاظ سے اٹو کھا ہے کہ اس میں صرف نثر ہے۔ شاعری کا کوئی نمونہ شروع سے آخر تک نہیں۔ جولائی کے شمارے میں میں نے چھپائی غزلیں اور چوبیس نظمیں لکھی تھیں۔ "کہتی ہے طلق خدا" میں ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ کیا اردو میں صرف شاعری ہوتی ہے؟ بہر حال اس جدت سے میں خوش ہوا حالانکہ میں شاعری کا بچپن سے دلدادہ اور خود بخود بھولے بھٹکے شعر کہنے والا ہوں۔ شعر میرے مدگ و پے میں ہے اور اس کی آواز ہمارے گھرانے میں مسلسل گونجتی رہی ہے۔ اللہ اب یہ گھرانہ اس بزرگوں سے خالی ہو گیا ہے جن کے سینوں میں شعر اور اس کا ارتعاش اس طرح محفوظ تھے جیسے ستارے کے تاروں میں سونے ہوئے نئے۔ مجھے شعر میں جس تک، جس ارتعاش کی تلاش رہتی ہے وہ عمر سے بعد مزید نیازی کی دو چھوٹی چھوٹی نظموں میں دکھائی دی۔ بڑی سادہ پر کار نکلیں ہیں۔ جب

شب خون



کوئی شعر یا نظم زندگی کے کسی کوئے کو چھو لیتی ہے اور دور تک کوئی منظر کھول دیتی ہے جو کہیں  
 حند کے میں پڑا سو رہا تھا تو ایک عجب ابتزاز، اور یہ بھی میرے دل میں تھا، کا احساس ہوتا  
 ہے۔ میر نیازی کی خصوصاً "صادقہ" دلی لکھ میں بڑی دلکشی اور دوری ہے۔

یہ تو خیر کسی پچھلے شمارے کی بات تھی۔ تازہ شمارے میں کئی عمدہ افسانے اور  
 مضامین ہیں لیکن جو خاصے کی چیز ہے وہ حبیب حق صاحب کا "شریف زادہ" سیکول یا تہ  
 (۲) ہے جس کو انھوں نے "مرد مجاہد، مرد ناتواں" کا عنوان دیا ہے۔ کیا کردار انھوں نے  
 تخلیق کیا ہے اچھے گمان بلکہ تقریباً یقین ہے کہ اس کا اور کچھ نہیں ہو سکتا کیوں نہ کہیں موجود ہے، غالباً  
 نئی یادگاری میں ورنہ بیانیہ میں وہ سچائی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو مصنف کی فن کاری نے  
 افسانے اور بانیوگرافی کے پیوند سے پیدا کی ہے۔ پھر اس میں جس طرح تاریخ کی روح جاتا،  
 مازندران، دہلی، بھڑو، انگ، طمان، لاہور اور دلی سے ہو کر نئی یادگاری تک پہنچتی ہے، جو  
 صلیب کے تاریخی سفر کا احساس اور بیان ہے اس میں بڑی کھل بصیرت ہے۔ کیا حبیب  
 میاں صاحب اس داستان کو آگے بڑھائیں گے یا پھر چھوڑ دیں گے؟ ابھی تو ان کا دوست  
 اور کہانی کا کردار خدا رکھے زندہ اور سلامت ہے اور شب اور مانتاب باقی ہیں۔ البتہ  
 حضرت شریف حسن اب مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تحسین کی سرحد پر پہنچ گئے ہیں۔

حیدر آباد  
 ● شمارہ ۲۷ کی فہرست میں شاعری نہ دیکھ کر کچھ تعجب سا ہوا، اور کچھ  
 مایوسی بھی ہوئی۔ لیکن حبیب حق کے "مرد مجاہد، مرد ناتواں" نے جو وہ طبق روشن کر دیے۔  
 مارول

● "شب خون" ۲۷ کے افسانے دل کو کھینچتے ہیں، خاص طور پر سید محمد  
 اشرف، نیر مسعود اور حبیب حق کے افسانے۔ "مردار خور" سے صاف نظر آ رہا ہے کہ سید محمد  
 اشرف ایک بہت ہی معرکہ آرا ناول اردو ادب کو دینے والے ہیں۔ جس سادگی، سچائی  
 اور پختگی کے ساتھ وہ قلم کا استعمال کرتے ہیں ان سے مجھے پنجک کی یاد آ جاتی ہے۔ نیر  
 مسعود ہمیشہ سے میرے بہت ہی پسندیدہ افسانہ نگار رہے ہیں اور ہر افسانے کے بعد میری  
 تعلق ان کی تخلیقات کے لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ "پاک ناموں والا پتھر" ایک معدوم  
 یاد دہنی ہوئی تہذیب کا منظر نامہ ہے۔ میں ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا  
 کیونکہ میں ان کے سلسلے میں ذرا جانب دار ہوں۔ مگر "مرد مجاہد، مرد ناتواں" شائع کر کے  
 ایک بار آپ نے پھر ثابت کر دیا ہے کہ آپ سے کسی طور سہقت لے جانا ممکن ہے۔ اگر  
 چند غلطیاں ہمیں نظر انداز کر دی جائیں تو حبیب حق کا یہ افسانہ مابعد جدیدیت کے انداز کا  
 ایک نمونہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس میں مابعد جدیدیت کے کچھ عناصر کارفرما نظر آتے  
 ہیں مثلاً dispersal (جب واقعات کے تانے بانے ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں)  
 antithesis (جس کے لئے مصنف بار بار قاری کو تیار کرتا ہے جب وہ وقت کے  
 chronological order (توزنا ہے) inter-text (کہ تخلیق کو آپ کسی  
 boundary یا حصار میں قید نہیں کرتے) metonymy (اس میں مختلف مقام پر  
 استعاروں سے گریز کرتے ہوئے صنعت بیان میں نئے انداز اپناتے گئے ہیں) اور سب  
 سے بڑھ کر irony جو افسانے کے اختتام تک بے قرار ہے۔ میرا خیال ہے یہ سارے  
 عناصر لا شعوری طور پر خود بخود آ گئے ہیں، ان میں کہیں بھی آواز کا گمان نہیں ہوتا۔ باقی

اکتوبر ۲۰۰۳ء / ۲۷

افسانے کچھ زیادہ اچھا تاثر نہیں چھوڑتے۔ انور قمر سے اس سے بہتر افسانے کی امید کی  
 جاتی ہے۔ وہ بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔

کولکٹہ  
 ● "شب خون" اس بار الف سے لے تک پورا ایک نشست میں پڑھ گیا۔  
 سید محمد اشرف اور نیر مسعود کے افسانے خود کو پڑھوا لینے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ نیر  
 مسعود کے افسانوں کی خوشبو کچھ دھکی دھکی ہی ہوتی ہے جس میں سب کچھ بہت قدیم ہوتا  
 ہے اور اکثر پراسرار بھی۔ پراسراریت اس بار سید محمد اشرف کے افسانے میں بھی ہے۔ اس  
 میں بھی گزشتہ دو سال کا عکس زیادہ حاوی ہے۔ حبیب حق صاحب کو پہلی بار  
 افسانہ نویس کے روپ میں دیکھا۔ ان کا افسانہ کئی ایک ادوار پر محیط ہے۔ مگر افسانہ کہیں  
 جا کر دم نہیں لیتا، اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے۔ انھوں نے "سوار" والے افسانوں کا آغاز کر  
 مطالعہ کیا ہے اور اس کا اثاثر ان پر سوار ہے کہ دیکھتے ہی جنتی ہے۔ مقصود الہی شیخ کے  
 افسانے میں جو صورت حال پیدا کی گئی ہے وہ دلچسپ ہے۔ دوسروں کو نصیحت دینے والے  
 خود بھی دودھ کے دھلے نہیں ہوتے۔

اقبال مجید نے نئے نئے نکتے والوں کو بڑا قیمتی مشورہ دیا ہے۔ مگر نئی نسل اتنی ہلکی  
 میں ہے کہ شاید ہی وہ ان باتوں پر کان دھرے۔ قاضی سلیم نے اپنے انٹرویو میں بڑے  
 افسانہ نگار اور اسے اختصار سے کام لیا ہے کہ تخلیق باقی رہ جاتی ہے۔

راجندر یادو کے سلسلے میں میرا بھی یہی خیال ہے کہ ان کی باتوں کا جواب  
 معتدل لہجے میں بھی دیا جاسکتا تھا۔ بہر حال انھوں نے یہ غلطی ضرور کی کہ جن باتوں کو وہ  
 ٹھیک ڈھنگ سے نہیں جانتے اس پر انھیں فیصلہ کن انداز میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔  
 ابھی میں نے کلیشور کے ہول "کتے پاکستان" کا ترجمہ پڑھا۔ اس میں بھی بڑی بکواس  
 ہے اور شبلی اور اقبال کی خوب چڑی ادبیز گئی ہے۔ خصوصاً اقبال کو تو ملاحظات سنائی گئی  
 ہیں۔ تم نے راجندر یادو کو جواب دیتے ہوئے ٹھیک ہی کہا ہے کہ گریب کی جو دوسب کی  
 ہو جاتی۔

راہی  
 ● اگم ٹیکس کشن ہونے کے باوجود سید محمد اشرف ایسے عمدہ لکشن نگار ہیں اور طر  
 حیرت میں فرق ہونے کا مقام ہے۔ نیر مسعود صاحب سب معمول حیرت انگیز طور پر  
 چونکانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، افسانہ خوب ہے۔ آپ نے گیدمر (Gadamer) پر اچھا  
 نوٹ لکھا۔ میں اس سے پوری طرح اتفاق نہیں کر سکتا، لیکن وہ بہر حال عمدہ منظر تھا۔  
 کولکٹہ

● شمارہ ۲۷ میں بھی محض نثری مواد شامل ہے۔ پتہ نہیں یہ تہذیبی بالارادہ  
 ہے یا اتفاقی ہے۔ بہر حال تہذیبی بذات خود ایک لفظ کی چیز ہوتی ہے لہذا اسی تہذیبی نے  
 اس شمارہ کو ایک خصوصی شمارہ کی حیثیت دے دی ہے اور اس خالص نثری محفل میں جناب  
 سید محمد اشرف کا "مردار خور"، جناب نیر مسعود کا "پاک ناموں والا پتھر"، جناب انور قمر کی  
 کشتی، جناب حبیب حق کا "مرد مجاہد، مرد ناتواں"، جناب مقصود الہی شیخ کا "دو چار قدم  
 اور"، آئندہ لہر کا "تین دن بعد" سبھی افسانے ہیں۔ پڑھنے والوں کا ذوق افسانہ خوانی  
 پوری طرح محفوظ ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ مصنف افسانہ کی مطالعہ پڑیری وہ بارہ لوٹ آئی



ہے۔ اسی شمارہ میں جناب اقبال مجید کا مضمون "زندانی کے خواب اور جشن انہو" حالانکہ شاعری سے متعلق ہے لیکن نظم اور نثر دونوں سے یکساں مطابقت رکھتا ہے۔

جناب حبیب حق کی تحریر "مرد مجاہد، مرد ناتواں" دلچسپ ہے لیکن اس کے متعلق سوال یہ ہے کہ اس کو کس زمرے میں رکھا جائے۔ روزنامہ، سوانحی یا خودنوشت سوانح؟ روزنامہ کے زمرے میں رکھتے ہیں قیامت یہ ہے کہ کوئی انداز تاریخی طور پر سلسلہ وار نہیں ہے۔ سوانح کی نوع رکھتے ہیں پس و پیش یہ ہے کہ بیشتر حصے میں مکالمہ کو بروئے کار لایا گیا ہے جو سوانح کے حسب مزاج نہیں ہے۔ خودنوشت سوانح ہونے کا جہاں تک سوال ہے تو اس کی وضاحت مصنف ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اگر شریف الحسن نقوی مصنف سے الگ شخصیت ہیں تو اس پر ایسے کاروائی کون ہے؟

● اور قمر کا افسانہ "کشتی" (سرحد پر کاش کے نام) خوب ہے لیکن افسانے کا انتہائی میں متاثر نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ "کشتی" کا خاتمہ حسب ذیل ہوتا تو بہتر ہو جاتا کہ "اس کے دل میں بوجھیا کے بیٹوں کے لوٹ آنے کی امید اب پہلے سے زیادہ محکم ہو چکی تھی لیکن۔"

● کیا جانتے کس عالم میں شمار ۲۷۰ کا مطالعہ ہوا کہ احمد مشتاق، لطف الرحمن، عرفان ستار، حسن عباس، اسعد بدایونی اور ثناء احمدی حیدری کی فزلیں برادر است دل میں اتر گئیں۔ کرشن کار طور، ظفر گورکھ پوری، سلطان اختر، مدحت اختر، ایدار احمد، اکرم محمود کے اشعار بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔

● مجھے حیرت ہے کہ ترقی پسندوں کا سب سے بڑا مخالف حوامی مصنفین کی لابی یعنی تحریروں اور اشتراکی نغمہ کا دشمن باوجود مخالفین کی کاوشوں کے آج بھی اپنے مشن میں کامیاب ہے۔ جدیدیت کے ہانیوں میں شمس الرحمن فاروقی کی حیثیت راہبر کی سی ہے۔ "قاضی سلیم سے گفتگو" اور "مرد مجاہد، مرد ناتواں" خوب تر ہیں۔ صفحہ (۶۰)۔ (۶۹) اور (۷۲) پر رسائل کے نام اور مدبران کے نام کے ساتھ پارے پتے بھی ہوتے تو قارئین کے لئے مفید ہوتا۔ ترقی پسند ادب نے نوجوان نسل کی رہنمائی کی یا اسے بے راہ رو کیا، مذہب سے دوری عطا کی اس پر تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے تاکہ "شب خون" کے نئے قاری جو کمبزم اور اشتراکیت کے زمانے کے بعد ادب سے وابستہ ہوئے، یا جو اردو ادب سے استفادہ کریں و ترقی پسندی کے اثرات سے واقف ہو سکیں۔

● شمارہ نمبر ۲۷۰ شاعری اور ۲۷۱ نثر نمبر ہے۔ اول الذکر میں ایک سے ایک فزلیں اور نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ نثر میں تمہیدی نوٹ، اخبار و اذکار، سوانحی گوشے اور قاریوں کے خطوط شامل ہیں۔ شمارہ کی پہلی تخلیق بصورت نثر اور آپ کی تحریر کے مطابق نظم نوشتہ "اسد محمد خاں" ہے جس کے متعلق "اس بزم میں" کے عنوان سے آپ نے لکھا ہے۔ یہ نظم ایک محبوب و مقبول معاصر کو خراج عقیدت ہے اور موسیقی کی روح کو الفاظ میں بیان کرنے کی غیر معمولی کوشش بھی۔ "اس کے بعد فزلیوں اور نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے

اور آخر تک چلتا رہا ہے۔ ظفر گورکھ پوری کی صرف ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے "خیموں میں ان کے آگ لگائی جاسکتی ہے مائل ستم کی نیند اڑائی جاسکتی ہے۔ آج کل دنیا میں شاید یہی ہو رہا ہے۔"

● اتنی ساری غزلیں اور نظموں کا جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں ہے بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان سے تھوڑا بہت لطف اندوز میں بھی ہوا اور جو کک اور کی باقی رہ گئی تھی اس کی خلافی آپ نے شمارہ نمبر ۲۷۱ میں کر دی۔ سید محمد اشرف سے لے کر آخر تک کے افسانہ نویسوں اور مقالہ نگاروں بھی نے متاثر کیا۔ محمد اشرف صاحب نے تو "مردار خور" میں ایک اٹوکھا نسوانی کردار بھی پیش کیا ہے۔ اور رشید انصاری صاحب کا انٹرویو مختصر مگر خیال انگیز ہے۔ قاضی سلیم ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں "جدیدیت کا جب آغاز ہوا تو کئی انتہا پسند شاعروں نے اپنی ذاتی طامات کا جوہم اور ناقابل فہم نہیں، استعمال کیا۔ یہ شاعری ایک معما بن کر رہ گئی۔" میری ناقص رائے میں یہ روایت تو اب بھی قائم ہے اس فرق کے ساتھ کہ اس میں بے کاد اور بھونچا پن نہیں ہے۔ اس شمارے کی تمام مشمولات مجھے جان دار اور پر لطف لگیں مگر فردا فردا ہر ایک کا ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اقبال مجید کا مقالہ سردار جعفری کے متعلق ایک نئے زاویے سے لکھا گیا ہے اور اچھا ہے لیکن میرے خیال میں وہ نہ جانے کیوں چھوٹی ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کیسے سمجھ لیا کہ اور لوگ مطالعہ نہیں کرتے؟ ہاں ان کا یہ کارنامہ ضرور ہے کہ جعفری صاحب کے ہم گیر مطالعہ اور محنت نظر کو انھوں نے اس انداز سے غالباً پہلی مرتبہ پیش کیا ہے۔ آپ بہت اچھی روایت یہ قائم کر رہے ہیں کہ ہندی کے متعلق بھی اردو والوں کو روشناس کر رہے ہیں۔ پریسل پریشن لندن کا مضمون اور نجم فاروقی کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ اس سے ہندی کے ادب اور شعرا کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے تمہیدی نوٹ اور سوانحی نوٹ اور قاریوں کے خطوط کے متعلق کیا پوچھنا۔ دونوں شماروں میں بڑے پر مغز ہیں۔ ان کے ذریعہ میرے علم میں ہمیشہ اضافہ ہوتا ہے۔

● "اس بزم میں" آپ نے مجھ کو شامل کر کے بھی شامل یوں نہیں کیا کہ میرا نام "رشید انصاری" کی جگہ "رشید الدین" لکھا گیا ہے۔ نیز یہ کہ میں اب "منصف" سے نہیں بلکہ روزنامہ "عوام" سے وابستہ ہوں۔ اس اخبار کے پبلیکل میگزین سیکشن سے وابستگی ہے اور آزادانہ طور پر سیاسی مضامین (زیادہ) اور ادبی مضامین (کم) مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں شاید آپ کی بھی نظر پڑی ہو۔

● گزشتہ شمارے میں آپ نے ہمارا گوشوارہ عمل شائع کیا تھا۔ ہم آپ کے ممنون ہیں۔ یہ گوشوارہ جو اردو زبان کے تحفظ، فروغ اور اس کے حقوق کی بحالی سے تعلق رکھتا ہے، اردو معاشرہ کا ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے ذوق، احساس فرض و ضرورت اور وسائل کے مطابق اس پر مددگار کام کو عملی بنانے میں حصہ لے سکتا ہے۔

● اردو چونکہ ہماری مادری زبان ہے اس لئے ہم سب لوگ، تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ، اسے جانتے ہیں اور بلا تکلف بولتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے وہ بھی اردو جاننے والوں میں ہیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہماری بہت بڑی تعداد اردو لکھنا



پڑھنا نہیں جانتی۔ اس میں غیر تعلیم یافتہ اور تعلیم یافتہ دونوں شامل ہیں اور اس وجہ سے ہم لوگ اردو کو اپنے بہت سے روزمرہ کے کاموں میں استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھنا کوئی مشکل کام ہے۔ اردو نہ جاننے والوں کے لئے اردو زبان سیکھنا مشکل ہو سکتا ہے، لیکن جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان کے لئے اس کا لکھنا پڑھنا سیکھنا نہایت آسان کام ہے۔ یاد رکھئے ہمیں اردو نہیں سیکھنا ہے۔ اردو ہم جانتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اس کا لکھنا پڑھنا سیکھنا ہے۔ اردو کی الف بے تے گھنے پڑھنے اور ان حروف کو ملا کر لکھنا پڑھنا سیکھنے سے یہ غریبی بہت تھوڑے وقت میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک انداز سے کے مطابق اگر ہم ایک ماہ تک ایک گھنٹہ روزانہ اردو کے حروف چھی اور ان کا ملانا لکھنا پڑھنا سیکھیں تو کافی ہوگا اور اگر تین ماہ تک اس عمل کو جاری رکھا جائے تو وہ بھی خاصی مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

اردو رسم الخط دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح اردو کے حروف چھی اس کے اپنے ہیں اور ایک طویل تاریخی عمل کے مرہون منت ہیں۔ جنہی آوازیں (اصوات) اردو میں ہیں شاید دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے اردو بولنے والے دنیا کی کسی بھی زبان کو نسبتاً جلد سیکھ لیتے ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں غیر زبان کا ان کا تلفظ بھی اہل زبان جیسا ہو جاتا ہے۔

اس دور میں اردو بولنے والے معاشرے کے سامنے ایک بہت ہی اہم مسئلہ اپنی زبان، کلمہ اور تشخص کے تحفظ کا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ پرائمری تعلیم کو جس حد تک ممکن ہو اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور اس شعبے میں بیشتر عمل خود کریں، دوسروں کی طرف نہ دیکھیں۔ موجودہ حالات میں یہ سب بالکل قابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ زبان اور کلمہ کے تحفظ کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ اگر ہم اپنی زبان اور کلمہ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ فطری اور موثر پرائمری تعلیم و تدریس و تربیت صرف مادری زبان کے توسط سے ممکن ہے۔

ہم جس اردو کے تحفظ کی بات کرتے ہیں اسے اس عام بول چال کی زبان کے حوالے سے سمجھنا چاہئے جو گنگا جمنی کلمہ کا جزو ہے اور جو ایک طویل تاریخی عمل سے گذر کر شمالی اور وسطی ہندوستان کے بڑے علاقوں میں عام بول چال کی زبان بن چکی ہے۔ ہم جس زبان کو ایک عرصے سے ہندوستانی کہتے آئے ہیں وہ ہمارے ملک کے متحدہ ہندوستان تمام علاقوں کی بول چال کی زبان ہے۔ اردو اسی ہندوستانی بول چال کی معیاری شکل ہے۔ اسی وجہ سے فلمی صنعت کے پہلے دن سے آج تک ہماری فلموں کی مقبول ترین زبان اردو ہی رہی ہے اور اردو فلمیں تمام برصغیر میں اور برصغیر کے باہر بھی جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے کئی ملکوں میں بڑے شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ اردو کے وطن کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستانی کے سب علاقے اردو کے علاقے ہیں۔ جو علاقے اب ہندی کے کہے جاتے ہیں وہ سب اردو کے ہیں یا اردو کے بھی ہیں۔ اردو نہ کبھی بے گھر تھی نہ ہوئی، نہ ہو سکتی ہے۔ اور اس دور میں تو اپنے گھر کے باہر بھی ساری دنیا میں اردو کے مراکز پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ، کناڈا ہر جگہ اردو بچتی رہی ہے۔ دنیا کے تمام بڑے اور اہم ترین ریڈیو اسٹیشن جو نہیں کہنے میں کئی بار اردو خبریں، مباحثے اور کچھ لکچرل پروگرام نشر کرتے ہیں جن سے "سارے

اکتوبر ۲۰۰۳ء / ۲۷

جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے" کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اردو کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اردو کا ضیع و تخریج خارجی نہیں بلکہ خود ہمارے عوام ہیں، ہماری زمین اور ہماری تاریخ ہے۔ آنکھیں اگر کھلی ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ دور کتنا ہی پر آشوب کیوں نہ ہو اس کا ایک اطمینان بخش پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو کسی دوسرے کے حقوق زیادہ دیر تک پامال نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی ہمارا حق دہائے رکھ سکتا ہے نہ ہم کسی کا۔ ہم کسی کا حق دہائیں رہے۔ ہمارا ضمیر صاف ہے۔ جذبات ہمیں پر امید رہتا چاہئے۔

اگر آپ کسی اخبار یا رسالے سے خشک ہیں تو اپنے موثر جریڈ سے میں تھوڑی سی جگہ صاف فرما کر اس پروگرام کی مزید اشاعت اور ترویج کر سکتے ہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی کالج اسکول میں ہیں تو اس پروگرام کو تحریک بنا سکتے ہیں۔ اگر ادیب یا مضمون نگار ہیں تو اپنی تحریروں میں کبھی کبھی اس پروگرام کے عملی پہلو اور اپنی مدد آپ کے اصول کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ اگر کسی مدرسے میں ہیں تو دین کی حقیقی تعلیم اور اس کی روح تک رسائی کے لئے اور اپنے نصاب کے درس و تدریس کو آسان، عام فہم اور موثر بنانے کے لئے اردو کی نگزیریت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پورے پروگرام کو اپنے مدرسے میں عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرتے ہیں، خطبہ دیتے ہیں، یاد دلاتے ہیں تو بڑی آسانی سے اس پروگرام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں اور ان میں اپنی مادری زبان سے محبت اور وفاداری کے جذبات کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پروگرام کی فوٹو کاپیاں بنا کر تقسیم کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ آپ کچھ بھی کرتے ہوں، جہاں کہیں بھی ہوں، کسی بھی محل میں ہوں، اپنے گرد و پیش میں کم از کم مادری زبان کی پوری شکل و صورت کے تحفظ کا جذبہ پیدا کر ہی سکتے ہیں۔

ہمارے دور میں اردو کے حقوق بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ذہنی خالق یہ ہیں کہ اردو کا استعمال سرکاری اور تعلیمی سطحوں پر یا تو بالکل بند کر دیا گیا ہے یا محدود رکھا جا رہا ہے۔ جب ہم اردو کے ان حقوق کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہیں تو دراصل ہم اردو معاشرے کے اکثریتی اور اقلیتی دونوں طرح کے علاقوں میں سرکاری اور تعلیمی سطحوں پر اردو کا آزادانہ استعمال چاہتے ہیں۔ یہ وہ حق ہے جو ملک کی دوسری تمام زبانوں کو اس ملک میں حاصل ہے اور جو پہلے ہمیں بھی حاصل تھا اور اب نہیں ہے اور بے انصافی کی کوئی مقبول وجہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال ہماری ہر و کاری کے باوجود اس حق کی بحالی میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اس جملہ صورت حال کے پیش نظر ہمارے لئے اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ اردو کے حقوق کی بحالی کا بہت گہرا تعلق ان سب باتوں سے ہے جو بڑے نظر پروگرام میں بیان کی گئی ہیں۔ اگر نظر جائز دیکھیں تو اس پروگرام کے مقاصد کے حصول سے اردو کے حقوق کی بحالی کا عمل آسان ہو سکتا ہے۔ پہلے وہ کام کریں جو پہلے کرنا چاہئے۔ ہمارے نقطہ نظر سے اپنی عملی حیثیت میں یہ پروگرام بالکل مقامی ہے اس لئے اسے شروع کرنے کے لئے کسی بڑی تیاری یا نقل و حرکت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جزوی عمل درآمد میں تو کسی تاخیر کی ضرورت ہی نہیں۔

اردو مرکز، ہاپوڑ، ۲۳۵۱۰۱

عزیز احمد



● مدیہ پردیش حکومت کا اقبال سان سال مشہور شاعر ڈراما وٹر لکھارفت سروس کو ملا ہے۔ یہ انعام ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے اور ایک سند اعزاز پر مشتمل ہے۔ ہم اس انعام پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔

● ایڈورڈ سعید (پیدائش ۱۹۳۵ء) کی موت ایک عالم کو ہسر وہ کر گئی۔ انھوں نے ادبی تنقید اور ثقافتی تاریخ و فلسفہ میں لازوال نقوش چھوڑے اور فلسطین کے مقصود کے لئے ان کی جدوجہد اور بے خوف جنگ نے انھیں ساری دنیا کے مظلوم اور بے دخل کئے ہوئے لوگوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ایڈورڈ سعید کو ۱۹۳۸ء میں اپنا گھریلو غم چھوڑنا پڑا جب اسرائیلی حکومت نے وہاں کے لوگوں کو بے دخل کر کے ترک وطن پر مجبور کیا۔ قاہرہ اور امریکہ میں تعلیم پانے کے بعد وہ کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے اور بعد میں "یونیورسٹی پروفیسر" کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب Orientalism (مطبوعہ ۱۹۷۸ء) میں دکھایا کہ "مشرق" حضرات نے بھی مغربی سامراج کی اتنی ہی خدمت کی ہے جتنی مغربی سیاست دانوں نے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مستشرقین کا علم اور ان کے مطالعات بھی اقتدار قائم کرنے، اقتدار قائم رکھنے اور مشرق کو مجبور و محکوم بنانے رکھنے کے عمل میں معاون رہے ہیں۔ اس کتاب پر دو ایلا بہت ہوا لیکن اس نے گزشتہ پچیس سال کی مغربی اور مشرقی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنے مخصوص طرز فکر کو کام میں لاتے ہوئے Beginnings اور The World, The Text, and The Critic اور Imperialism جیسی کتابوں کے ذریعہ خود کو اس زمانے کے اہم ترین نقادوں میں تسلیم کرایا۔ انھوں نے اپنی خود نوشت Out of Place میں جلا وطنی، عرب تشخص اور دہشت گردی کے بارے میں بھی خیالات پیش کئے۔ ایڈورڈ سعید کا بنیاد پر یہ بھی ان کی طرح فلسطینی مقصود کے لئے گرم عمل ہے۔ ہم مرنے والے کے حق میں دعاے خیر کرتے ہیں۔

● جب سے ہمارے وزیراعظم محترم کو بعض اردو محفلوں نے شاعر بن لیا ہے اس وقت سے ان کی پارٹی کے دیگر رہنمایان بھی اردو زبان اور شاعری کے نقاد کہلانے کے شوق میں جگمگا اٹھتے ہیں۔ چنانچہ وٹے کنیار صاحب نے اردو کو دہشت پرستوں کی زبان بتایا ہے۔ پچہ نہیں وہ مہرانی کو کیا کہیں گے جس کا بولنے والا اربنل شادون "م دنیا کی نظروں میں دہشت گرد قرار پا چکا ہے۔ اردو زبان کی اس توہین پر ہم سخت احتجاج کرتے ہیں۔ ایک اور بزرگ رہنما پر سود مہاجن نے فرمایا ہے کہ اقبال کا ہندوستان کے لئے یہ کہنا کہ ہم بلیں ہیں اس کی یہ گستاخ ہمارا بے معنی ہے، کیونکہ ہماری تہذیب میں تو وطن کو ماں کہا جاتا ہے۔ استعارے سے ان کی بے خبری اور شعری زبان سے ناواقفیت کے اس مظاہرے کا جواب ایک ہندو خاتون نے خوب ہی دیا کہ گلستان اور بلبل میں وہی رشتہ ہے جو دھرتی ماما اور اس کے بچوں میں ہے۔

● میر انیس پر یہ گفتگو ۱۲ اگست ۱۹۹۱ء کو انوار احمد خاں کے زیر اہتمام لکھنؤ یونیورسٹی پر تین قسطوں میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ یہ کئی بار نشر ہوئی اور اپنے سلسلے کی مقبول ترین گفتگوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی تیسری قسط نکل سکی، لیکن دو قسطوں کی اس ٹیپ کو بنارس کے نوجوان ادیبوں جاوید انور اور عارف ہندی نے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ ● اوم پر بھاکر ہندی کے سربراہ آوروہ نقاد اور شاعر ہیں۔ کچھ دن ہوئے وہ گوالیار یونیورسٹی میں صدر شعبہ ہندی کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے ہیں۔ اردو انھوں نے اس زبان اور اس کی شاعری کی محبت میں لکھی ہے۔ "شب خون" میں ان کی پہلی آمد ہے۔ ہم ان کا استقبال کرتے ہیں۔ ● نامور شاعر اور نقاد مجسم کاکمیری، کچھ مدت سے نوکیو یونیورسٹی، جاپان میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف "اردو ادب کی تاریخ، ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک" دور و نزدیک سے فرائض حسین وصول کر رہی ہے۔ ● رمیش راز کا تدار کارگل سے سری نگر، کشمیر ڈاکٹر آل انڈیا یونیورسٹی، جے پور سے ہو گیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "انہاد" جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ ● سنی سوہاری اپنا پہلا مجموعہ کلام ترتیب دے رہے ہیں۔ ● گزشتہ شمارے کا سرورق عادل منصور نے بنایا تھا۔ ہم نے سہا ان کی جگہ احمد نواز رزاقی کا نام لکھ دیا تھا۔ ہم اپنے دونوں دوستوں سے اعتذار کرتے ہیں۔ ● شمس الرحمن فاروقی کی کتاب "فلاٹ روزمرہ" کچھ مہینے ہوئے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی۔ اب اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن ادارہ "آج" نے کراچی سے شائع کر دیا ہے۔ فاروقی کے افسانوں کے مجموعے "سوار" کا ہندوستانی ایڈیشن حال میں شائع ہوا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اور شہر یار کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی پہلے ہی علی مسلم یونیورسٹی اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی کورٹ کے رکن رہ چکے ہیں۔ ● محمد اظہار الحق کا نیا مجموعہ کلام "پانی پر بچھا سٹھ" ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ محمور سعیدی کا نیا مجموعہ کلام "راستہ اور میں" چند ہفتے ہوئے شائع ہوا ہے۔

## سوار

اور دوسرے افسانے

شمس الرحمن فاروقی

(ہندوستانی ایڈیشن)

قیمت : دو سو روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳